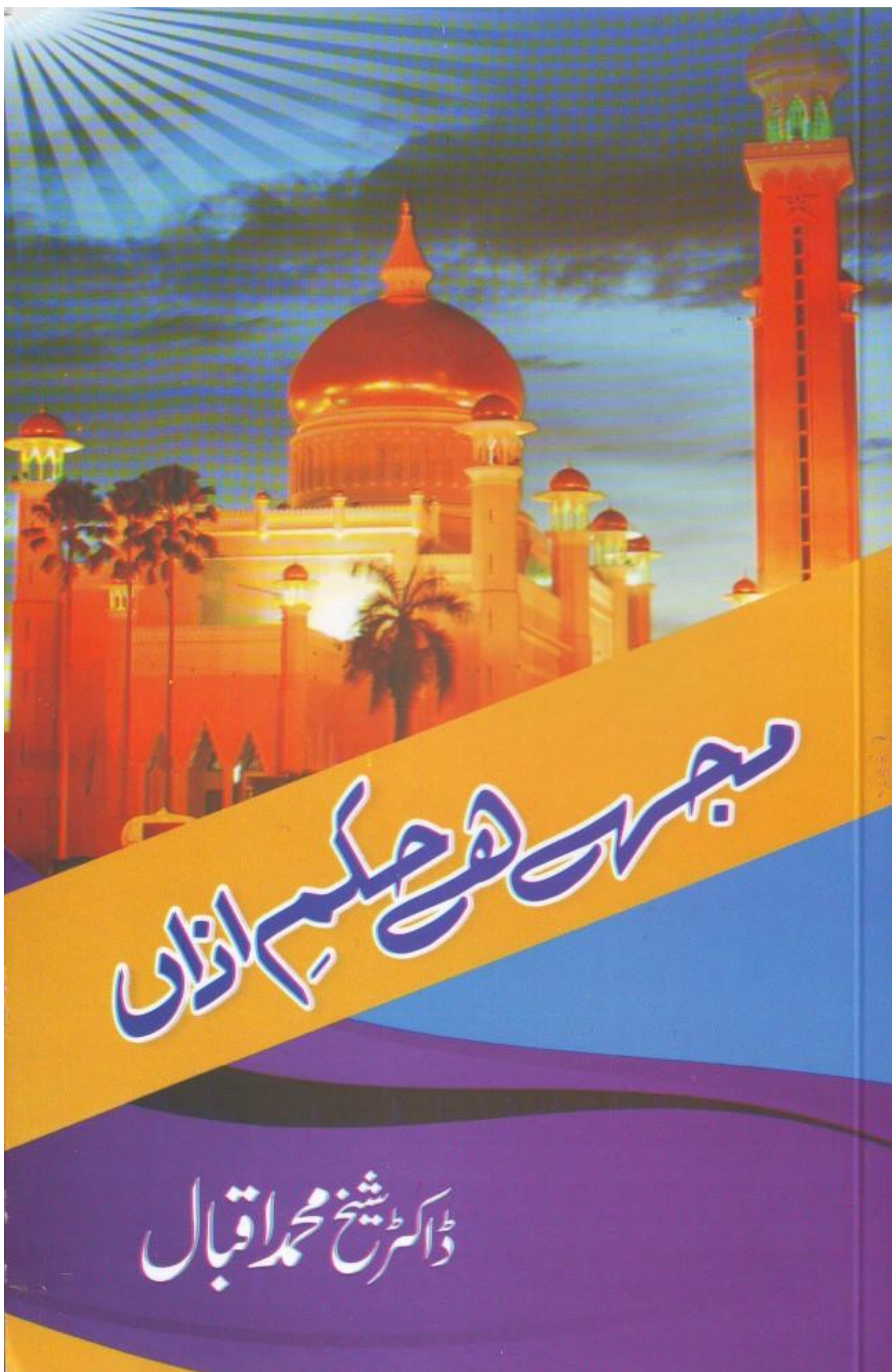

مجھے ہے حکمِ اذاں
ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

مجھے ہے حکمِ اذاں

(مجموعۂ مضامین)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

ایم اے انگلش، ایم اے اُردو

ایم فل (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ ڈی

اشاعت	2012ء
تعداد	۳۰۰
طابع	ثنائی پریس سرگودہا
قیمت	۲۰۰ روپے
کمپوزنگ	تنویر احمد
سرورق	ظہور فائن آرٹس سرگودہا
ناشر	پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال

ملنے کا پتہ:

131۔ رحمت پارک یونیورسٹی روڈ سرگودہا

048-3226686,0300-4489399

شاہد بخاری ایڈووکیٹ

651/D فیصل ٹاؤن لاہور

042-35161149,0300-4855148

انتساب

بھلے دنوں کے نام
جنہیں بالآخر پلٹنا ہی ہے
انشاءاللہ

اظہارِ تشکر

ماہنامہ سفید چھڑی کے اداریوں پر مشتمل یہ پانچویں کاوش ہے۔ پہلی دو کاوشوں میں نابینا افراد کے مسائل کے حوالے سے ماہنامہ "سفید چھڑی" کے اداریے شامل ہیں اور کم و بیش ۴۰۔۴۵ مسائل کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کچھ تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ یہ دو کتب "دیدۂ دل" اور "ذوقِ تماشا" کے نام سے شائع ہوئی تھیں اور بعد ازاں "کب رات بسر ہو گی"، "آشوبِ آگہی" کے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں عمومی معاشرتی مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ نفسیاتی، عمرانی اور معاشی مسائل پر کھل کر بات کی جائے۔ ہاں میں اسے کوشش یا ناتمام کوشش کا نام ہی دوں گا کیونکہ ابھی ممکن ہی نہیں کہ دو ٹوک الفاظ میں کھری اور سچی باتیں کی جا سکیں۔ جانے وہ وقت کب آئے گا، جب بھی آئے گا وہ بہت ہی اچھا وقت ہو گا، امید رکھنی چاہیے، کیونکہ امید پر ہی ہمارے احساس کی توانائیوں کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔

"مجھے ہے حکمِ اذاں" کی تحریروں میں بھی میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ قلم کے حوالے سے جو تھوڑا بہت کردار میں ادا کر سکتا ہوں کر دوں، مجھے یقین ہے کہ ایسی کاوشیں بار آور ضرور ہوتی ہیں اگرچہ حالات انتہائی حوصلہ شکن ہیں مگر پھر بھی حوصلوں کو مضبوط رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنی بہت سی تحریروں میں اپنی ذات پر بیتے واقعات کا حوالہ دیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب بھی مجھے ابتلاء و آزمائش سے دوچار ہونا پڑا میرا اندرونی مدافعاتی نظام جانے کیونکر متحرک ہو گیا اور مشکلیں ختم ہو کر رہی ہیں اگر یہ ارادہ کر لیا جائے کہ مشکلوں سے گھبرانا نہیں اور ایمان مضبوط ہو کہ جب کوئی مشکل سر اٹھاتی ہے تو اس کا سر قلم کرنے کی سبیلیں بھی نکل آتی ہیں تو پھر مشکل اپنی تلخی اور شدت کھو بیٹھتی ہے لیکن اکثر و بیشتر ہم لوگ مشکلوں کو اپنے سر پر سوار کر لیتے ہیں اور یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم بے بس و لاچار ہیں۔

معاشرتی حوالوں سے بھی ہم مشکلوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ حالات اتنے مخدوش ہیں کہ ان کے سنورنے کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی اور یہ کہ انفرادی طور پر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ سمندر کے سامنے قطرے کی کیا بساط ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بہر حال قطروں کے مجموعے ہی سے دریا اور سمندر متشکل ہوتے ہیں۔ ایک ایک بوند سیلاب کو جنم دیتی ہے۔ ایک ایک کرن تاحدِ نظر روشنی کا باعث بنتی ہے۔ اس لئے فرد کو بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ افراد ہی معاشرے کو جنم دیتے ہیں۔

اس کتاب کی تمام تحریروں میں میرا یہی یقین مجھے قوت بخشتا رہا ہے اور یہی یقین ہر مشکل کو آسان بنانے کی جانب پہلا قدم تصور کیا جانا چاہیے، ہم اس یقین کے بل بوتے پر مایوسیوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ پیرہنِ شب تار تار کر سکتے ہیں اور ظلم اور زیادتی کے خلاف صف آراء ہو سکتے ہیں۔ انصاف کی قوتوں کو توانائی عطا کر سکتے ہیں اور زندگی کو خوش گوار، سہل، دلکش بنا سکتے ہیں۔ اس کتاب کے مختلف مراحل میں میرے احباب نے میرا بھرپور ساتھ دیا ہے یہ احباب اللہ کی دین ہیں اور اللہ کی کون کون سی نعمتوں کا شمار کیا جائے۔ وہ بے حد و بے شمار ہیں میرے احباب نے مجھے ہمیشہ حوصلہ دیا ان میں روحی کنجاہی، سعید احمد بودلہ، شاہد بخاری ایڈووکیٹ، خالد اقبال، سید نسیم الغنی، عبدالباسط سہیل ایڈووکیٹ، پروفیسر شاہد اسلام دانش، پروفیسر اشرف شاہین شامل ہیں۔ اس کتاب کو کتاب کی شکل دینے میں میرے اور بہت سے احباب بھی شامل ہیں جن میں اقبال نثار، تنویر احمد، رانا محمد اقبال، ملک اسحاق کنڈا اور بہت سے احباب شامل ہیں۔

ڈاکٹر شیخ اقبال

27 جولائی 2012ء

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

خواجہ محمد زکریا

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے بہت سی اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے، ان کی تحریریں کسی ایچ پیچ اور ابہام کے بغیر ان کے مافی الضمیر کا اظہار کرتی ہیں، میں ہمیشہ صاف شفاف واضح اور شستہ تحریروں کو پیچ در پیچ مبہم اور ژولیدہ تحریروں پر ترجیح دیتا ہوں اس لئے ڈاکٹر صاحب موصوف کا اندازِ بیان میرے مزاج کے قریب تر ہونے کی وجہ سے میرا پسندیدہ اندازِ تحریر ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے بیس برس سے کچھ زیادہ عرصے سے ایک ماہنامہ "سفید چھڑی" کے نام سے جاری کر رکھا ہے۔ جسے وہ بڑی باقاعدگی سے شائع کرتے ہیں جو حضرات اس قسم کی صحافت سے کبھی تعلق قائم کرنے کی کوشش کر چکے ہیں انہیں اندازہ ہے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ کسی ماہنامے کا باقاعدگی سے پیٹ بھرنا، مالی مشکلات کے علاوہ، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مدیر ہمہ وقت اسی کے بارے میں سوچے، منصوبہ سازی کرے اور ترتیب و اشاعت کے جملہ مراحل کو خود پر طاری کئے رکھے، اہلِ علم و ادب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر شیخ اقبال ان مراحل کو کس کامیابی سے طے کر رہے ہیں۔

ماہنامہ "سفید چھڑی" کے اداریے خاصے کی چیز ہوتے ہیں جن میں ہمارے معاشرے کو درپیش مسائل کی نشاندہی کی جاتی ہے اور انہیں حل کرنے یا بہتری پیدا کرنے کے لئے تجاویز پیش کی جاتی ہیں، ان کے مخاطب دانشور اور اربابِ اختیار دونوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں انسان کو اپنی سی سعی کرنے اور اس کی کامیابی یا ناکامی سے درگزر کر کے حتی المقدور اچھے کاموں کی تلقین کرتے رہنے کا حکم دیا ہے۔ حافظ شیرازی نے بھی اس خیال کو یوں پیش کیا ہے۔

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بندِ این مباش کہ نشنید یا شنید

ڈاکٹر اقبال نے ہمارے معاشی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی غرض تمام مسائل کی طرف توجہ دلانے کو اپنا فرض عین جانا ہے۔ چونکہ وہ صاحب مطالعہ ہیں اور دلِ دردمند بھی رکھتے ہیں اس لئے مسائل کی تفہیم کے ساتھ ساتھ بڑے خلوص اور دردمندی سے انہیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں سیاسی اور سماجی مسائل کی پیش کش کے علاوہ ان کے اداریوں سے ہمارے معاشرے کی اجتماعی نفسیات کا ایک ایسا مرقع تیار کیا جا سکتا ہے جس سے معاشرتی اصلاح کی بہترین کوششوں کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کا یہ مجموعہ چشم و دل کی بیداری کا سامان مہیا کرتا ہے اس کا مطالعہ ہر اس شخص کو کرنا چاہیے جو معاشرے کے موجودہ رجحانات سے ناخوش ہے اور اسے سنوارنے کی خواہش رکھتا ہے۔

مجھے ہے حکمِ اذاں

زاہدہ صدیقی

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ممتاز شاعر، ادیب، دانشور اور ماہرِ تعلیم ہیں۔ بطور شاعر ادب کی دنیا میں ان کا ایک مقام ہے تو بطور نثر نگاری بھی ان کی ایک واضح پہچان ہے۔ بطور ماہرِ تعلیم ان کی شناخت تعارف کی محتاج نہیں تو بطور دانشور بھی انہوں نے اس معاشرے کو بہت کچھ دیا ہے، انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر امید، روشنی، حوصلے اور جہدِ مسلسل کا درس دیا ہے تو اپنی ذات میں اُمید، روشنی، حوصلے اور جہدِ مسلسل کرنے والی ایک متحرک شخصیت کا نمونہ بھی پیش کیا ہے انہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ کوئی بھی مشکل حوصلہ مند شخص کا راستہ نہیں روک سکتی چاہے یہ مشکل کسی جسمانی مجبوری کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ ظاہری نظر کی کمی انہوں نے باطن کی نظر سے یوں پوری کی ہے کہ ان کے تخلیق کردہ ادب اور ان کی دیگر علمی ادبی اور سماجی خدمات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے قاری حیرت زدہ ہو جاتا ہے، انہوں نے اپنی ذات کو زندگی میں کامیاب و کامران ہونے کی آرزو رکھنے والوں کے لئے زندہ و متحرک مثال بنا دیا ہے۔

"مجھے ہے حکمِ اذاں" ڈاکٹر صاحب کے ۳۲ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انہوں نے ہر موضوع پر بے لاگ گفتگو کی ہے اور اپنے مشاہدات، تجربات اور خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ سارے مضامین اس قابل ہیں کہ توجہ سے پڑھے جائیں ان میں سے بعض تو اس قابل ہیں کہ بچوں کے نصاب میں شامل کر لئے جائیں۔

مضامین کا دائرہ وسیع ہے مگر ان سب میں جرأتِ اظہار کے ساتھ ساتھ پاکیزگیٔ فکر بھی نمایاں ہے اور ملک اور قوم کو مثالی ملک و قوم دیکھنے اور افراد کو علم و حکمت اور اخلاق کے اعتبار سے مثالی افراد دیکھنے کی آرزو بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔

مضامین میں علمی، ادبی، تعلیمی اور سماجی ہر طرح کے مضمون ہیں۔ وہ انگریزی کے استاد ہیں، انہوں نے انگریزی ادب کے حوالے سے بھی ایک مضمون کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ جس میں ولیم شیکسپیئر کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں عالمی گاؤں کا چراغ قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے اس نابغۂ روزگار کی ان مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے جو اسے درپیش ہیں مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور انگریزی ادب کا ایک ایسا زندہ رہنے والا مصنف بن کر ابھرا جس کی تخلیقات کے باعث قاری کو زندگی کا قاری قرار دیا جا سکتا ہے۔

مضمون "مجھے ہے حکمِ اذاں" جس کا عنوان کتاب کے نام کے لئے منتخب کیا گیا ہے بڑی حد تک کتاب کا کلیدی مضمون ہے جو دعوتِ حق اور بے باکی سے ان اسباب وعوامل کا تجزیہ پیش کرتا ہے جن کے سبب ہم بطور قوم زوال پذیر ہیں۔ بطور فرد کے اخلاقیات سے عاری ہوتے جا رہے ہیں اور باطل قوتیں ہم پر غلبہ حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ بنیادی سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے اعلیٰ اقدار کا تحفظ نہیں کیا، روحانیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، اخلاقیات کو پسِ پشت ڈال کر اپنی ہی اخلاقیات وضع کر لی ہیں اور الفاظ سے ان کے اصل معانی چھین لئے ہیں۔ یہ ایک چشم کشا مضمون ہے جسے بغور پڑھنے اور ہماری نئی نسل کو پڑھانے کی ضرورت ہے، مضمون کو معروف مثالوں اور علامہ اقبال کے اشعار سے بھی مزین کیا گیا ہے۔

"یہ کافر دل نہیں مانا" کو بڑی حد تک "مجھے ہے حکمِ اذاں" کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس تمنا کا اظہار کیا گیا ہے کہ ہمیں پھر ایسے رہنما درکار ہیں جو نہ جھکتے ہوں نہ بکتے ہوں۔

"مری منزل خدایا دور کر دے" ایک دعوتِ فکر و عمل اور حوصلہ مندی کا درس دینے والا مضمون ہے۔ جس کا عنوان ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک شعر سے لیا ہے۔ مضمون میں ان مشہور و معروف شخصیات کا ذکر بھی کیا ہے، جنہوں نے مشکلات کو ہمت و حوصلہ کے ساتھ عبور کیا اور نام پیدا کیا اور خود اپنا مختصر سوانحی خاکہ بھی دیا ہے جسے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے

بینائی کی کمی کو ایک چیلنج جانا اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے دنیائے شعر و ادب میں نام بھی پیدا کیا۔ وہ اپنی ذات میں حوصلہ مندی کی درخشاں مثال بن کر نمایاں ہوئے ہیں۔

"طلبِ علم" علم اور اس پر عمل کے حوالے سے ایک اہم مضمون ہے جو ضروری حوالوں سے مزین ہے اور دلائل سے بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے حصولِ علم کے ساتھ ساتھ حاصل کردہ علم پر عمل کرنے پر ہی زور دیا ہے۔ ان کی آرزو ہے کہ علم پھیلے اور اس پر عمل بھی ہو۔ قاری تحریر سے محض لطف اندوز نہ ہوں بلکہ اس سے زندگی میں تحرک کا کام بھی لے اور یوں علم سے کما حقہٗ استفادہ کرے۔

"الکاسب حبیب اللہ" میں محنت کی عظمت کا بیان ہے، پیغمبروں کی مثالیں دے کر محنت بالخصوص ہاتھ سے کام کرنے کی فضیلت اور عملی زندگی میں اس کے فوائد کا ذکر موثر انداز میں کیا گیا ہے، انہوں نے بڑی دردمندی سے اپنے معاشرے کا تجزیہ کرتے ہوئے اس امر پر کرب کا اظہار کیا ہے کہ ہاتھ سے کام نہ کرنے اور فی الوسع ہر کام مشینوں سے لے لینے کا چلن عام ہو جانے کے باعث ہمارے ہاں امراض بڑھ رہے ہیں، لوگ صحت سے محروم ہو رہے ہیں اور ہاتھ سے کام کرنے کو عار سمجھنے لگے ہیں اس طرح صرف جسمانی ہی نہیں ہماری ذہنی صحت بھی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔

"ڈپریشن" بھی ایک قابلِ مطالعہ مضمون ہے۔ جس میں بزدلی اور مایوسی پیدا ہونے والے عوامل کا تجزیہ کیا گیا ہے اور مایوس شخص سے ہمدردی کی بجائے مایوسی کو مضحکہ خیز قرار دے کر ان الفاظ میں مایوسی کا علاج تجویز کیا ہے۔

"جس قوم کے پاس قرآنِ حکیم جیسا دستورِ حیات ہو، جس کو اپنے خدا پر غیر متزلزل یقین ہو، جس کو اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہو اسے بھلا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے" "پاکستان پائندہ باد" میں ایک دردِ دل رکھنے والے محبِ وطن پاکستانی کی صدائے دردناک جھلکتی ہے۔ جس سے دکھائی دیتا ہے کہ جن مقاصد کے لئے پاکستان کی تعمیر ہوئی تھی وہ نظر انداز ہو چکے ہیں۔ جو

خواب تشکیل پاکستان کے وقت دیکھے گئے تھے، چکنا چور ہو چکے ہیں۔عالم یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی قومی درد بے معنی لفظ بن چکا ہے۔ہر طرف دولت کے لئے لوٹ مار اور طرح طرح کے جرائم کئے جا رہے ہیں۔ملک ڈوبتا نظر آتا ہے مگر بچانے کے لئے جدوجہد کرنے والے رہنما میسر نہیں ہیں اور تو اور عوام بھی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں،انہیں بھی احساس نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ہم کس تباہی کے گڑھے کی طرف گامزن ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں انہیں جگانے کی سعی کی ہے اور دولت مندی کی دوڑ میں شریک لوگوں کو بھی انتباہ کیا ہے؟

"دوستو!اگر ہم سوتے رہے تو یہ مملکتِ خداداد خدانخواستہ ہم سے چھن بھی سکتا ہے،(خاکم بدہن)اور اگر چھن گئی تو کہاں جائیں گے، یہ کوٹھیاں یہ بنگلے، یہ پلازے، یہ ایوان کہاں جائیں گے، سوچیے، ۔۔۔۔ذرا سوچیئے۔۔۔۔۔خدا کے لئے سوچیئے۔۔۔اپنے بچوں کے لئے سوچیئے۔۔۔سوچیئے۔"

"کب رات بسر ہوگی" کو بھی اسی مضمون کی توسیع کہا جا سکتا ہے جو ایک فکر انگیز مضمون ہے۔"وراثت اور ماحول کا جبر"،سول سوسائٹی۔۔۔۔۔ایک ناقابلِ تسخیر قوت""یہ لوگ کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتے"،"دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ"؛"حقوق و فرائض میں رسہ کشی"، ہمارے معاشرے کی تصویر کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں،مصنف نے گو اپنے معاشرے کا، معاشرے میں گرتی ہوئی اقدار کا اور اس نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشرتی صورتحال کا دردمندی سے تجزیہ کیا ہے کہ اور اخلاقی اقدار کی پامالی اور انسانی رشتوں کے تقدس کی موجودہ مسخ شدہ صورتِ حال پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔اور تمنا کی ہے کہ اخلاقی قدروں کا احیاء ہو جائے،انسانی رشتوں کا تقدس پھر عام ہو جائے، ہمارا معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن کر ابھرے،ایسا کیسے ممکن ہوگا،بتاتے ہیں۔

"آیئے محبت کی شمعیں روشن کریں، پیار کے چراغ جلائیں،اپنے بزرگوں کی عزت کریں،اپنے بچوں سے شفقت سے پیش آئیں،اپنے پڑوسیوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، اپنے شہر اور اپنے ملک کو محبت کا گہوارہ بنا دیں"

"چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" عزم و ہمت کے ساتھ سفر جاری رکھنے کا درس دے رہا ہے۔اور پڑھنے والوں کو تحریکِ عمل دے رہا ہے۔دلائل اور مثالوں کے ساتھ رقم کیا گیا یہ ایک نہایت اچھا اور مؤثر مضمون ہے۔

"کفرانِ نعمت""تقیدِ مکرر"،"بے سروپا"،"نغمے کو نوحہ نہ بننے دیجئے"،"ہو محفلِ یاراں تو بریشم کی طرح نرم"، شاخِ گلاب، یا اللہ، دریائے ہمت کا شناور، با زوالے نیاز کیا جانیں، حجِ اکبر، شخصیت کا سحر، ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے، پھول اور کلیاں، خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بھی بہت اچھے مضامین ہیں جو یقیناً لائقِ مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ادیبوں اور فنکاروں کو نظر انداز کئے جانے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ "بےچارے ادیب اور بےسہارا فنکار" میں بجا طور پر دکھ کا اظہار کیا ہے کہ جہاں ایک چھکا یا چوکا لگانے پر کھلاڑی کو مالا مال کر دیا جاتا ہے اسی سرزمین پر ساری ساری عمر ادب و فن کی خدمت کرنے والوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔کتاب اہمیت کی حامل ہے،موضوعات اہم ہیں،اندازِ تحریر دلپذیر ہے،امید ہے کہ اسے مقبولیت کا درجہ حاصل ہوگا۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1۔	طلبِ علم	15
2۔	الکاسب حبیب اللہ	19
3۔	چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی	22
4۔	ڈپریشن	25
5۔	پاکستان پائندہ باد	29
6۔	مجھے ہے حکمِ اذاں	33
7۔	یہ کافر دل نہیں مانا	38
8۔	کفرانِ نعمت	42
9۔	قیدِ مکرر	45
10۔	بے سروپا	49
11۔	وراثت اور ماحول کا جبر	52
12۔	سول سوسائٹی۔ایک ناقابلِ تسخیر قوت	56
13۔	نغمے کو نوحہ نہ بننے دیجئے	58
14۔	ہو محفلِ یاراں تو بریشم کی طرح نرم	61
15۔	شاخِ گلاب	64
16۔	یا اللہ!	69
17۔	دریائے ہمت کا شناور	74
18۔	یہ لوگ کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتے	77
19۔	ناز والے نیاز کیا جانیں	81

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
20۔	دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ	84
21۔	کب رات بسر ہوگی	88
22۔	حجِ اکبر	93
23۔	مری منزل خدایا دور کر دے	97
24۔	شخصیت کا سحر	101
25۔	حقوق و فرائض میں رسہ کشی	104
26۔	ہَمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے	107
27۔	پھول اور کلیاں	110
28۔	خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں	115
29۔	عالمی گاؤں کا چراغ۔۔۔ولیم شیکسپیئر	119
30۔	”بے چارے ادیب“ اور ”بے سہارا“ فنکار	123
31۔	مشاعرے کیا ہوئے!	126
32۔	دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم	129
33۔	غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا	132
34۔	ترقی	136

طلبِ علم

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے طلبِ علم ہی طلبِ زندگی ہو کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ علم ہی زندگی ہے اگر آپ کے پاس اچھا اسلوبِ حیات ہی نہیں تو آپ کی زندگی کسی طور پر بھی اچھی طرح نہیں گزر سکتی، بڑی سے بڑی ایجادات آپ کے لئے بے معنی ہیں جب تک آپ انہیں استعمال کرنا نہیں جانتے۔ جب ایک بچہ آنکھ کھولتا ہے تو روزِ اول ہی سے وہ شعوری طور پر نہ سہی لاشعوری طور پر یا یوں کہہ لیجئے جبلی طور پر اپنے ماحول کو جاننے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے یہ جاننے کی خواہش نت نئے رخ اختیار کرتی ہے، ماہرینِ نفسیات متفق ہیں کہ بچے کی توڑ پھوڑ سعیِ لاحاصل نہیں بلکہ اشیاء کی ماہیت جاننے کی خواہش ہے، جاننے کی خواہش ایک آفاقی خواہش ہے شاید حضرتِ آدم نے شجرِ ممنوعہ کا پھل اس لئے بھی چکھا تھا کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ بالآخر یہ ہے کیا، گویا تجسس خواہشِ علم کا دوسرا نام ہے۔ بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی جاننے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام کو وحی کے ذریعے علم دیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نبی اکرم کو سب کچھ بتا دینا چاہتے تھے لیکن پھر بھی جو کلمات نبی اکرمؐ کے ہونٹوں پر رہتے تھے وہ ہم سب جانتے ہیں یعنی مرے اللہ مرے علم کو زیادہ کر، دراصل علم کی کوئی حد نہیں، کائنات وسیع و عریض ہے بالکل ابھی دریافت ہی نہیں ہوئی

بقول علامہ اقبالؒ

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

گویا تخلیق کا عمل ابھی جاری و ساری ہے، ابھی نت نئے حقائق منظرِ عام پر آ رہے ہیں، نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں علم کی سرحدیں وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہیں۔ سائنس کیا ہے؟

ایک علم ہی تو ہے جو کچھ سائنس نے ہمیں دیا وہ پہلے سے موجود تھا مگر نامعلوم تھا، گویا سائنس نامعلوم سے معلوم کا سفر ہے۔ نیوٹن اپنی سائنسی فتوحات کے بعد کہتا تھا کہ میری مثال تو یوں ہے کہ جیسے علم کے سمندر کے قریب کنکریاں، کسی نے کہا تھا کہ ہم جس قدر زیادہ علم حاصل کرتے ہیں اسی قدر زیادہ ہمیں اپنی جہالت کا احساس ہوتا ہے گویا علم تو اپنی جہالت کو جاننے کا تدریجی علم ہے۔

جب علم کی اس قدر اہمیت ہے کہ پہلی وحی علم کے حوالے سے اترتی ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ عزیزانِ وطن علم سے کوسوں دور دکھائی دیتے ہیں، ہمیں طالب علم کم اور عالم و فاضل زیادہ دکھائی دیتے ہیں بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے موجود ہیں لیکن تشنگانِ علم کا انتہائی فقدان ہے خوفناک کمی ہے، کتاب سے تعلق منقطع ہو گیا ہے، بہت سے سند یافتگان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے نصاب میں کیا کیا شامل تھا۔ بس انہوں نے چند سوالات تیار کر لئے تھے، چند گائیڈز سے استفادہ کیا تھا اور بہت اچھے نمبر لے لئے تھے، اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کر لی تھیں اور پھر ڈگریاں تقسیم کرنے والے بلا کے سوداگر ہیں انہیں تو بھاری فیسیں اور داخلے کی رقوم درکار ہیں ان کی بلا سے جنہیں وہ ڈگریوں سے نواز رہے ہیں وہ ان ڈگریوں کے اہل ہیں یا نہیں، جگہ جگہ یونیورسٹیوں کا جال پھیلا دیا گیا ہے، مگر کتنی یونیورسٹیاں ایسی جہاں علم و تحقیق کے ذرائع موجود ہیں جہاں ایسے طالب علم موجود ہیں جو کئی کئی دن حقائق کو جاننے کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور حقائق کو جاننے کی تلاش میں انہیں بھوک اور پیاس تک کی پروا نہیں ہوتی، رات کی نیند اڑ جاتی ہے، دراصل ہم نے علم کو بھی طلباء کی دہلیز پر رکھ دیا ہے اور جو چیز دہلیز پر پڑی ہو اس کی اہمیت از خود ختم ہو جاتی ہے اور ایک تلخ حقیقت ہم سب کو معلوم ہے کہ عہدوں اور مدارج کا تعلق علم سے نہیں سماجی جاہ و جلال سے ہوتا ہے ڈگریوں کا حصول دولت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جاگیردارانہ نظام میں تو علم کی اہمیت ویسے ہی کم ہو جاتی ہے جاگیردار اپنی جاگیروں کے تحفظ کے فکر میں حقائق کو جاننے کے علم کو اپنے لئے سمِ قاتل گردانتے ہیں۔ چلیئے یہ تو جاگیرداروں کی بات ہوئی علم کے جاگیرداروں کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ وہ احباب جو تدریسی عمل سے وابستہ ہیں سوائے ان کتابوں کے اور کسی کتاب کا علم نہیں رکھتے جن کا درس انہیں اپنی کلاس میں دینا ہوتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بہت سے اساتذہ کرام اور معلمین عظام نوٹس کی صورت میں بڑی سنہری روایات کے امین ہیں اور اپنے طلباء وطالبات کو وہی نوٹس لکھواتے ہیں جو ان کے استاد نے لکھوائے تھے۔ اور ان کے استاد کے پاس نسل درنسل پہنچے تھے۔ علم کی یہ بے حرمتی نا قابلِ تفہیم ہے، علم جامد حقائق کا نام نہیں بلکہ حقائق کے ہر لمحہ نئے انکشافات کا نام ہے اگر آپ اقتصادیات کے معلم ہیں تو تب بھی آپ کے پاس دوسرے عمرانی علوم کا ہونا ضروری ہے اگر آپ ادب کے شعبے سے متعلق ہیں تو آپ کی عالمی ادب سے واقفیت ناگزیر ہے۔ استاد ایک ادارہ ہوتا ہے وہ ہر موضوع پر کچھ کہہ سکتا ہے کچھ لکھ سکتا ہے بلکہ ہماری رائے میں تو استاد بنیادی طور پر طالب علم ہوتا ہے جب کسی شخص میں طالب علم زندہ نہیں رہتا تو وہ علم کا نمائندہ بھی نہیں رہتا ایک طالب علم کو اپنی کتابوں سے سروکار ہوتا ہے مگر ایک ایسے طالب علم کو جنہیں ان طلباء کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے اس کا تعلق انسانوں سے ہوتا ہے چنانچہ وہ شخص جو شعبہ تعلیم سے منسلک ہے مگر کتابوں سے منسلک نہیں۔ اس میں تشنگی علم موجود نہیں، وہ تحقیق کے ذوق سے عاری ہے تو اسے اس شعبے سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہیے۔

ابھی پچاس ساٹھ سال پہلے ایسے اساتذہ موجود تھے جنہیں مل کر یوں لگتا تھا جیسے کہ انسائیکلو پیڈیا کے ورق کھل گئے ہوں۔ ہمہ دانی کا دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا مگر ہر لمحہ جاننے کی خواہش ہر ایک کے لئے ازبس ضروری ہے وطنِ عزیز کو جو عارضے لاحق ہیں ان میں سب سے بڑا عارضہ جہالت اور بے علمی کا ہے جاننے کی خواہش سرے سے ختم ہو چکی ہے۔ اور اس پر مستزاد اہلِ وطن علم سے لیس طاقتوں کا مقابلہ تیر وتفنگ سے کرنا چاہتے ہیں اور تیر وتفنگ سے علم کو شکست نہیں دی جا سکتی آپ کو علم کو شکست نہیں دینا ہے بلکہ حصول علم کے بعد ایک عالمی برادری کی تخلیق کرنا ہے۔ کیونکہ علم کا منتہیٰ انسانیت کی بھلائی ہے وہ علم جو صرف مادی اغراض کی تکمیل کے لئے ہو طاغوتی علم ہوتا ہے:

بقول مولانا روم

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر جاں زنی یارے بود

گویا علم کا تعلق روحانی بالیدگی سے ہے، تکبر سے نہیں فروتنی سے ہے۔ علم آپ کو وہ صلاحیتیں عطا کر دیتا ہے کہ آپ اپنے ماحول کو تسخیر کر لیتے ہیں اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور اس سے زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں، ہماری رائے میں ہمارے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ ہم میں علم کی بے پناہ خواہش موجود ہو، یاد رہے علم سے مراد محض جاننے کی عیاشی نہیں ہوتا بلکہ علم باعمل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ سائنس ٹیکنالوجی کو جنم دیتی ہے علم سے ہنر کے سوتے پھوٹتے ہیں اگر کوئی صاحب علم فصاحت وبلاغت سے آپ کو مسحور کر دے تو یہ کوئی طمانیت کی بات نہیں بلکہ اسے اپنے تبحرِ علمی سے زندگی کے سمندر کو متحرک رکھنا چاہئے اور اس سمندر سے زندگی کے دریا رواں دواں رہنے چاہئیں اور یوں روئیدگی کا عمل جاری ہو جانا چاہیے اور ارتقاء کی ہر لحظہ نئی صورتیں سامنے آنی چاہئیں۔

☆☆☆☆

اَلکاسبُ حبیبُ اللّٰہ

عروسِ حیات نے کیا کیا رنگ بدلے ہیں، کیا کیا روپ دھارے ہیں، کبھی دل وجاں کی ملکہ بنی تو کبھی بے نیلِ مرام، مایوس، بے رنگ اور بے کیف، کبھی زندگی خوشیوں کے ہنگھوڑے میں جھولتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، تو کبھی کانٹوں کے بستر پر دراز۔ انسان سراپا حیات ہے، حرکت ہے، انقلاب ہے، ایک تبدیلی ہے، ایک تنوع ہے، حیات کی پرستش انسانی صلاحیتوں کی پرستش ہے لیکن بُرا ہوا انقلاباتِ زمانہ کا جس کے باعث اعلیٰ اقدار اپنا رنگ وروپ کھو بیٹھیں اور حدفِ تنقید وتمسخر بنیں، ایک وقت تھا کہ محنت کو عظمت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، جفاکش انسان قابلِ صد احترام تھا اور دنیا میں ارتقاء وانقلاب کا ضامن تھا۔ پیغمبروں اور نبیوں نے اپنے لئے محنت کش کا ماڈل پسند کیا، کسی نے لکڑی کا کام کیا تو کسی نے لوہے کا، ہمارے پیارے نبیؐ نے بکریاں چرائیں، تجارت کی اور اپنے ہاتھ سے ہر کام کیا اور پھر یہ سنتِ نبویؐ بڑی دیر تک وظیفۂ حیات بنی رہی لیکن جب دولت وثروت کی ریل پیل ہوئی، ذرائع پر ایک گروہ کا قبضہ ہوگیا تو بندہ وآقا کی تفریق عمل میں آئی، تمام انبیاء اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دولت وعسرت میں تفریق وامتیاز بڑھتا رہا اور کام کرنے والے کو کمی، گھٹیا اور کم درجے کا تصور کیا جانے لگا، اس میں کلام نہیں کہ قدیم یونان میں افلاطون نے اپنی کتاب ''جمہوریہ'' میں اپنی خیالی ریاست میں ذہنی طور پر کم استعداد رکھنے والوں کو محنت کیلئے منتخب کیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ محنت سے متعلق اشخاص کے بارے میں نظریات بری طرح تبدیل ہوتے رہے۔ خود ہمارے معاشرے میں امیر وغریب کے درمیان خوفناک کشمکش زندگی کا جزوِ لاینفک بنی ہوئی ہے اور اس سے متعلق کتنے ہی خونی ڈرامے زندگی کی سٹیج پر پیش کیے جاتے ہیں لیکن قدرت کا ایک اپنا ہی نظام ہے اور اس کے انتقام کا ایک اپنا ہی اسلوب ہے، طاقت ور لوگوں نے اپنے گھر تو بھر لئے، Bank Balance بڑھا لیا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی تمام نعمتوں کو ہتھیا لیا لیکن وہ اپنی

صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے، اپنی طاقت گنوا بیٹھے، بیماری اور موت کا شکار ہوگئے، جو محنت کش رہے وہ صحت اور تندرستی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے رہے اور جنہوں نے ہاتھ سے کام کرنے کو عار سمجھا اور حرکت میں برکت کی حقیقت سے انکار کیا وہ ہر نعمت سے ہاتھ دھو بیٹھے، جسمانی اور ذہنی صحت لازم وملزوم ہے جب جسمانی صحت چھن جاتی ہے تو ذہن بھی کام کرنا بند کر دیتا ہے، تندرستی ہزار نعمت ہے اور بیماری زحمت ہی زحمت ہے چنانچہ جو لوگ کام سے گریزاں ہوئے وہ مہلک بیماریوں کا شکار ہوگئے۔

فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب مل کر محنت کریں، کام کریں اور سب مل جل کر کھائیں لیکن ظالمانہ استحصالی نظام اس حقیقت کا منکر ہے اسے اس کی بدترین سزا مل رہی ہے لیکن پھر بھی حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ ناانصافی کی انتہا یہ ہے کہ کہیں سات آٹھ افراد ایک کمرے میں رہ رہے ہیں تو کہیں سات آٹھ کنال کی عمارت میں چند لوگ مقیم ہیں، انہیں تنہائی نگل لینا چاہتی ہے اور وہ اس سے دست وگریباں ہیں لیکن حقیقت پسندی کا ادراک کرنے پر تیار نہیں، اگر آپ پچاس ساٹھ سال پہلے کے طرزِ حیات پر نظر ڈالیں تو ہر طرف محنت کش نظر آئیں گے، کوئی سائیکل پر سوار، کوئی پا پیادہ، گھروں میں خواتین صبح سے شام تک گھریلو کاموں میں منہمک، دیہات میں مرد وزن ہمہ وقت فصلوں کی بوائی کٹائی اور دیگر امور میں جُوکار لیکن بُرا ہو سائنسی ایجادات وجدید ٹیکنالوجی کا جس نے ہر ایک سے قوتِ عمل چھین لی ہے، سائیکل سوار کاروں میں سفر کرنے لگے، گھریلو کام مشینیں سرانجام دینے لگیں، یہاں تک کہ ریموٹ کنٹرول سے ہر کام سرانجام پانے لگا، جنہوں نے دوسروں کی نعمتوں کو ہتھیا لیا وہ کسی بھی نعمت سے متمتع نہ ہوسکے۔ میز پر طرح طرح کے پکوان موجود ہیں لیکن انہیں استعمال کیا جا سکتا، سب کچھ موجود ہے مگر کچھ بھی موجود نہیں کیونکہ قدرت کی منشاء یہ نہیں کہ کوئی کمائے اور کوئی کھائے، کسی کا خون پسینہ بہے اور کوئی دادِ عیش دے، کوئی اینٹیں اور پتھر لگائے اور کوئی محلات میں خوش وخرم رہے۔ ان کے دست وپا شل ہوگئے، کوئی فشارِ خون کا شکار ہوا تو کوئی ذیابیطس کا، کسی کو موٹاپے نے آلیا تو کسی کے

گھٹنے جواب دے گئے، کسی کا نظامِ انہضام درہم برہم ہو گیا تو کسی کے جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا، کوئی دل کے عارضے کا شکار ہو گیا تو کوئی گردوں کے مرض میں مبتلا، یقین مانیے یہ سب اس لئے ہوا کہ اصولِ فطرت سے انحراف کیا گیا دولت و ثروت صحت و تندرستی نہ عطا کر سکی، دنیاوی جاہ و جلال، جسمانی قوت کا ضامن نہ ہو سکا اور جرمِ استحصال کی سزا از خود مرگِ مفاجات بن گئی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ قوتِ مدافعت جواب دے گئی، بازوؤں میں ہمت نہ رہی، پاؤں بے بس ہو گئے اور المناک صورتِ حال پیدا ہوئی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس اندوہناک صورتحال کے باوجود کوئی سبق سیکھنے کیلئے تیار ہی نہیں، کوئی اپنے معمولات میں تبدیلی کا خواہاں ہی نہیں۔ جم خانے آباد ہونے لگے ہیں لیکن جم خانے زندگی کے روزمرہ کے کام کاج کا متبادل ہو ہی نہیں سکتے، وہ انسانی قوت کو بحال نہیں کر سکتے۔ اسلام دینِ فطرت ہے یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے کام کرنے والے کو اللہ کا دوست قرار دیا ہے اور خود کام کر کے دکھایا ہے۔ ہم جو اپنے کلام اور تحریروں میں عاشقِ رسول اور فدائی نبیؐ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں آپ کی حیاتِ طیبہ کو ماڈل بنانے کیلئے تیار ہی نہیں، ہماری رائے میں انسانیت کو اپنے طرزِ حیات پر نظر ثانی کرنا ہو گی اور اپنے جسم کی بقاء کے لئے محنت کو اختیار کرنا ہو گا، خود اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہو گا، اپنے پاؤں سے چلنا ہو گا، بازوؤں سے بوجھ اٹھانا ہو گا اور اپنے ہر عضو کو کام میں لانا ہو گا اگر ایسا نہ ہوا تو تمام سائنسی سہولتوں کے باوجود تمام ادویہ کے ہوتے ہوئے اور تمام فہم و فراست کے باوجود انسان زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور ان نعمتوں سے بہرہ ور نہ ہو سکے گا جن کا وہ دل و جاں سے خواہاں ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ زندگی کو مکمل تباہی سے نجات دلائی جائے اور خود اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ نوش نہ کیا جائے کیونکہ یہ تو خودکشی ہو گی اور خودکشی حرام ہے۔ ہماری رائے میں انسان بے عملی کے زہر ہلاہل کے جام پر جام چڑھائے جا رہا ہے اور یوں اپنی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں اکٹھا کر رہا ہے۔

☆☆☆☆

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

سائنسی معلومات کے حوالے سے تو زندگی کروڑوں سال کا سفر طے کر چکی ہے۔ لیکن تمدنی زندگی کا سفر ابھی دو تین ہزار سال کا تصور کیا جاتا ہے اور اس زندگی کا آغاز یونانیوں کے شعور و آگہی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس سفر کی منزل کیا ہے؟ چلنے والے کس جانب چل رہے ہیں۔ انسانی تگ و تاز کا محاصل کیا ہے؟ ہماری رائے میں انسانی قافلہ ایک پر امن اور پر سکون وادی کی جانب رواں دواں ہے جہاں انسان اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکے اور بے خطر زندگی گزار سکے، جہاں استحصال نہ ہو، ناانصافی نہ ہو اور سب کو مساوی مواقع میسر آئیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ زندگی ابتلاء و آزمائش سے عبارت ہے اور قطرے کو گوہر ہونے تک جانے کن کن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے، چاروں طرف مختلف آزمائشیں ہیں، امتحانات ہیں اور خطرات ہیں لیکن انسان کا مجموعی خواب یہی ہے کہ انسان بطور انسان جینا سیکھ لے اور ایک معاشرتی انسان کے طور پر بود و باش کرنے لگے۔ یونانیوں نے معاہدہ عمرانی کر کے اس زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن پھر یونانی تہذیب و تمدن نیست و نابود ہو گئے اور معاہدہ عمرانی جانے کہاں کھو گیا۔ اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی اور پھر اہلِ روما نے جینے کے کچھ اسلوب تراشے جو ازمنۂ وسطیٰ کی نذر ہو گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ صحرائے عرب میں امید کی ایک کرن نمودار ہوئی جو آہستہ آہستہ آفتابِ عالم تاب بن گئی۔ لیکن پھر کچھ ایسی آندھیاں چلیں، کچھ ایسے اندھیرے نمودار ہوئے کہ سورج کی روشنی ماند پڑنے لگی، سولہویں سترھویں صدی میں تحریکِ احیائے علوم نے انسانیت کو شعور و آگہی عطا کرنے کا دعویٰ کیا۔ لیکن اس شعور و آگہی نے خون آشام مسابقت کا انداز اختیار کر لیا، جہاں صرف طاقتور کو جینے کا حق حاصل تھا۔ نٹشے (Nietzsche) نے قوت کو دیوتا تسلیم کر لیا اور کہا کہ بے سہارا اور تہی داماں افراد اور اقوام کو جینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ فلسفیوں، دانشوروں اور ماہرینِ تعلیم نے اس نظریے کی شد و مد سے مخالفت کی لیکن ان کی کوشش صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ جنگِ عظیم

اول اور جنگِ عظیم دوم نے ثابت کر دیا کہ انسان کا صدیوں کا سفر اکارت گیا اور اور ایسا لگا کہ وہ جہاں سے چلا تھا وہیں کھڑا ہے اور پھر جس دنیا میں ہم سانس لے رہے ہیں اس میں بظاہر تو سانس لینے کی گنجائش ہی نہیں، دم گھٹا جاتا ہے دل بیٹھا جاتا ہے اور سماجی انصاف اور انسانی مساوات کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے ہیں اور طاقت کا طوطی بولتا ہے، اسلحہ نے انسانی اقدار کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ لیکن کیا مایوسی ہی انسانیت کا مقدر ہے؟ کیا موجودہ شب کی کوئی سحر نہیں ہوتی ہے؟ کیا انسانیت کا ضمیر کبھی بیدار نہیں ہوگا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو اکثر پوچھے جاتے ہیں، ہماری رائے میں اندھیرے گہرے ہی سہی، رات طویل ہی سہی، لیکن اس کی صبح ضرور ہوتی ہے، جب تک یہ احساس باقی ہے اس وقت تک اندھیروں کے دوام کا کوئی امکان نہیں، اب بھی ایسے دل ہیں جن میں امید اور آرزو کی روشنی موجود ہے، ایسے اذہان ہیں جنہوں نے اب بھی مستقبل سے اپنی امیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں اور ہماری رائے میں نامعلوم طور پر انسانیت شعور و آگہی کی دولت سے مالا مال ہو رہی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اہم کردار ادا کر رہا ہے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے زندگی کی تمام تاریکیاں اور تمام اجالے ہماری نظروں کے سامنے ہیں، پرنٹ میڈیا بھی اپنا کردار ادا کر رہا ہے اور پھر رسل و رسائل کے وسائل کی فراہمی امید کی ایک اور کرن ہے۔ اب ہزاروں میل کا سفر گھنٹوں میں طے ہو سکتا ہے اور آپ دنیا کے کسی حصے میں رہنے والوں سے لمحوں میں تعلق قائم کر سکتے ہیں ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور یہ سب کچھ ہماری آس بندھاتا ہے کہ ہم تا دیر اپنے وجود سے غافل نہیں رہ سکتے، اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے، اپنے ہاتھ سے اپنا گلا نہیں گھونٹ سکتے، جب نا امیدی حد سے گزر جاتی ہے تو امید کی راہیں نکلنے لگتی ہیں، خدا کا شکر ہے کہ ایسی آوازیں موجود ہیں جن کو سن کر افسردہ دل سکون پاتے ہیں اور ایسے افکار و خیالات کی کمی نہیں جن کی مدد سے تعمیر انسانی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ آج بھی شعراء و ادباء انسانی بھائی چارے کے گیت گا رہے ہیں، آج بھی ہر مذہب میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو انسانیت کو ایک کنبہ سمجھتے ہیں، آج بھی یہ احساس زندہ ہے کہ ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے، اپنی کوششیں اور مساعی میں کمی نہیں آنے دینی چاہیے کہ چلنے والا

بالآخر کسی منزل پر ضرور پہنچتا ہے، اس میں کلام نہیں کہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہمیشہ جاری رہے گی اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم سنہری دور میں ہمیشہ کے لئے بود و باش کرنے لگیں گے، انسانی فطرت تغیر اور تبدیلی کی خواہاں رہی ہے، اب بھی ایسے ادارے موجود ہیں جہاں دکھی لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے نئی نسل کو زیورِ علم و ہنر سے آراستہ کیا جاتا ہے امن اور آشتی کا درس دیا جاتا ہے آج بھی خدائی صحیفے اور آسمانی کتابیں ہماری رہنمائی کیلئے موجود ہیں آج بھی ایسے اشخاص اور افراد موجود ہیں جو حسن و قبح میں امتیاز کر سکتے ہیں اور ایسی تحریکیں موجود ہیں جو انسانیت کیلئے پر سکون اور پر بہار ماحول کی متلاشی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ کوشش جاری رکھی جائے اور قویٰ میں کوئی اضمحلال واقع نہ ہو اور یہ یقین رکھا جائے کہ ابھی وہ طاقت موجود ہے اور قوتِ ناظمہ مستحکم ہے جو زندگی کا شیرازہ بکھرنے سے بچا سکتی ہے۔ جس کے دامن کو تھام کر پوری انسانیت ایک ہو سکتی ہے اور یہ طاقت ہے اس خدا کی جسے ہر مذہب اور ہر تہذیب تسلیم کرتی ہے اور جس نے ہمیں وہ احساس عطا کیا ہوا ہے جو تبدیلی اور تغیر لانے کے لئے کوشاں ہے۔

☆☆☆☆

ڈپریشن

گر دیکھئے تو وطنِ عزیز میں زندگی کی وہی چہل پہل ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو کبھی پہلے ہوا کرتی تھی، سڑکوں پر کاریں ہی کاریں ہیں، دُکانوں پر گاہک ہی گاہک، نت نئے ملبوسات، نت نیا اسلوبِ حیات، نت نئے زیورات، دولت کی ریل پیل، دستر خواں سجے ہوئے، ہر ایک کے ہاتھ میں موبائل فون، ہر گھر میں ٹیلی ویژن، لیکن اگر چند شہروں سے نکل کر دیکھیں تو ایسے افراد بڑی تعداد میں آپ کو نظر آئیں گے جن کے تن پر کپڑا ہے نہ سر پر چھت، نانِ شبینہ کو ترستے ہیں اور زندگی کی نعمتوں سے محروم ہیں، ناخواندہ، انجان، دیوانے، مارے مارے پھرتے ہیں لیکن یہ عجیب سانحہ ہے کہ دولت میں کھیلنے والے اور دولت سے محروم سب ہی، بسا اوقات مایوس، افسردہ اور پژمردہ نظر آتے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے لُٹ گئے، مٹ گئے، ختم ہو گئے، کچھ بھی نہیں رہا اور اگر غور سے سوچیں تو لگے گا کہ اس ساری مایوسی اور ساری افسردگی کے پیچھے بڑی حد تک ہماری اپنی خودغرضیاں کارفرما ہیں۔ مانا کہ قبائلی اور جاگیردارانہ نظام کا اژدھا ہر جگہ پھُنکار رہا ہے اور ایک ایسا نظامِ حیات وجود میں آ گیا ہے کہ اس سے مفر ممکن نہیں۔ مکڑی کے جالے کی طرح اس میں پوری قوم پھنس گئی ہے اور جالے کو کاٹنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حسن اتنا حسین نہیں ہوتا جتنا دیکھنے والی آنکھ اسے حسین بنا دیتی ہے۔ جاگیردار شاید اتنے ظالم نہ ہوں جتنا ظالم ہماری اطاعت شعاری اور فرمانبرداری نے انہیں بنا دیا ہے، جاگیرداری اور قبائلی اژدھوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہماری اپنی جہالت، ہماری اپنی کم کوشی اور آرام طلبی ہے یا یہ فلسفہ ہے کہ دولت، حشمت اور اطاعت اللہ کی دین ہے جسے دے دے، جسے نہ دے۔ اگر میرے تن پہ کپڑا نہیں، سر چھپانے کیلئے چھت نہیں، پیٹ بھرنے کے لئے کھانا نہیں تو احتجاج کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ایک ابتلاء و آزمائش ہے جس سے اللہ کے نیک بندوں کو گزرنا ہی پڑتا ہے، بس ہماری یہ قناعت پرستی جبر کو اور زیادہ جابر اور استحصال کو اور زیادہ

ظالمانہ بناتی رہی ہے اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ بے بسی اور مجبوری کا فلسفہ ہم نے خود تراشا اور پھر خود ہی ہم مایوسی کا شکار ہو گئے۔ آج وطنِ عزیز کے ۹۰ فیصد اشخاص ایک طرح کے ڈپریشن کا شکار ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ آس کے تمام دیپ گُل ہو گئے ہیں، امید کے تمام دیئے بُجھ گئے ہیں، آرزوؤں کے چراغ گل ہو گئے ہیں اور شاید اللہ ہم سے ناراض ہو گیا ہے، اللہ اتنا عظیم ہے، اتنا بخشن ہار اور رحیم ہے کہ وہ کسی قوم اور فرد سے اتنا ناراض نہیں ہوتا کہ اس میں اپنی حالت بدلنے کی قوت ہی نہ رہے، یہ الگ بات کہ ہماری یہ خواہش ہو کہ سب کچھ ہمارے لئے کوئی اور کر دے، دولت کی ریل پیل ہو جائے، خوشیوں کا دَور دَورہ ہو، محبت عام ہو جائے اور ہر چیز کی افراط ہو لیکن محض آرزو اور تمنا سے کچھ نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

یعنی یہ آرزو کہ سب کچھ کسی جادوئی قوت سے رونما ہو جائے، کوئی الہ دین کا چراغ ہمارے ہاتھ لگ جائے، زمین از خود خزانہ اُگل دے، سمندر ہماری جھولیوں کو موتیوں سے بھر دے، محبوب از خود آ کر بغل گیر ہو جائے اور وہ سب کچھ ہو جائے جو ہم چاہتے ہیں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر ہم شکایت کرنے لگتے ہیں، اُداس ہو جاتے ہیں اور مایوسی ہمیں گھیر لیتی ہے۔

ہماری رائے میں ڈپریشن ایک ایسی کیفیت ہے جس کے بڑی حد تک ہم خود ذمہ دار ہیں، ہمارے رویے اور ہمارا اسلوبِ حیات ناامیدی اور یاسیت کو جنم دیتا ہے، جب ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہوں گے تو پھر انتظار تلخ تر ہو جائے گا، ہمیں مایوس کر دے گا۔ ہمیں کسی طلسمی قوت کا انتظار نہیں کرنا ہے، از خود اپنی مٹی سے شعلۂ سینائی پیدا کرنا ہے، ہمیں اپنی بجھی ہوئی آگ کو جلانا ہے اور اپنی راکھ سے چنگاریاں تلاشنا ہیں۔ مانا کہ کام آسان نہیں، صدیوں سے جاری ظلم کی بیخ کنی کرنا، دامنِ شب کو تار تار کرنا اتنا آسان نہیں مگر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مشکلیں ہماری صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہیں، مشکلیں ایسی نعمتِ غیر مترقبہ ہو سکتی ہیں کہ اگر ردِ عمل

مثبت ہو تو کیا کہنے، شبِ تار، صبحِ روشن میں تبدیل ہو جاتی ہے، افسردگی کافور ہو جاتی ہے، اگر عمل کی شمعیں روشن ہوں تو اندھیروں کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ احمد فراز نے کیا خوب کہا ہے کہ

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

"شکوۂ ظلمتِ شب" ڈپریشن پیدا کرتا ہے اور اپنے حصے کی شمع جلانے سے ڈپریشن کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے، اللہ کا حکم ہے کہ اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، ناامیدی کا مطلب تو اپنے وجود ہی سے انکار ہے، خدا کی عظمت سے انکار ہے، اگر منفی رجحانات کی جگہ مثبت اقدار جنم لے لیں تو موجودہ مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ حکومت ان کے مسائل حل کر دے، حکومت چاہتی ہے کہ سارا کام اس کے لئے عوام کر دیں ایسا ممکن نہیں، مایوسی کا علاج اجتماعی طور پر مایوس کر دینے والی قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے۔ تاریخ کا سینہ ایسے اشخاص کی زندگیوں سے روشن ہے جنھوں نے اپنی شکستوں کو فتوحات میں تبدیل کر دیا۔ اندھیروں کو اجالوں میں بدل دیا، اسلام کی آمد سے پہلے صحرائے عرب ظلم اور زیادتی کا سرچشمہ تھا، امید کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، انسان انسان کا شکار کر رہا تھا اس میں کوئی مثبت سوچ موجود نہ تھی لیکن نبی اکرمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ صورت حال سے مایوس نہیں ہوئے، وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے واقف تھے کہ کوشش کرنے والوں کی جھولی میں اللہ سب کچھ ڈال دیتا ہے، مایوسی اندھیروں کو جنم دیتی ہے اور اجالوں کی نقیب ہوتی ہے، میرے یہ خیالات کسی دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ میری اپنی زندگی اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ کوشش سے ہر عقدہ حل ہو جاتا ہے۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ حراساں نہ شود

یا یہ کہ

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

ڈھونڈنے والوں کو نئی دنیا مل جاتی ہے، ہر متلاشی اپنی منزل پا لیتا ہے بشرطیکہ منزل کے حصول کی تڑپ دل میں موجود ہو، وطنِ عزیز کے پاس کیا کچھ موجود نہیں، معدنی وسائل، افرادی قوت، اللہ کا فضل، ایمان کی دولت، سب کچھ تو موجود ہے پھر کیا وجہ ہے مایوسی نے آن گھیرا ہے اور ہم ڈپریشن جیسے عارضے کا شکار ہوتے جا رہے ہیں، جس قوم کے پاس قرآنِ حکیم جیسا دستورِ حیات ہو، جس کو اپنے خدا پر غیر متزلزل یقین ہو، جس کو اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہو اسے بھلا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس صورتحال میں مایوسی مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہے اور کفرانِ نعمت کے مترادف۔

☆☆☆☆

پاکستان پائندہ باد

اپنے گھر سے ہمیں کتنا پیار ہوتا ہے اس کا اندازہ کم وبیش ہم سب کو ہے، ہم تو یہ تک جانتے ہیں کہ دیہات میں جب سیلاب آرہے ہوتے ہیں اور یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ گاؤں کے گاؤں ڈوب جائیں گے اس نازک وقت میں بھی ایسے اشخاص کی کمی نہیں جو کسی طور پر بھی اپنے گھر کو خیرباد نہیں کہنا چاہیں گے بلکہ چاہیں گے کہ وہ وہیں کہیں جان جانِ آفریں کے سپرد کردیں، میں اس جذباتی وابستگی کے جواز کی بات نہیں کر رہا ہوں مگر یہ امر اس حقیقت کے ادراک کے لئے کافی ہے کہ لوگوں کو اپنے گھر سے کتنا پیار ہوتا ہے، کتنی محبت ہوتی ہے، کتنی قربت ہوتی ہے اس مٹی سے جس میں کھیل کود کر، کھا پی کر وہ بچپن سے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہیں اور جوانی سے بڑھاپے کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ میری عمر کا ابتدائی حصہ خوشاب میں گزرا اور پھر میں کوئی چار سال شیرانوالہ گیٹ (لاہور) میں واقع نابینا افراد کے لئے سکول میں زیرِ تعلیم رہا آج تک جتنے خواب آتے ہیں اور جتنے سپنے دیکھتا ہوں ان کا پس منظر خوشاب کا گھر، خوشاب کی گلیاں اور خوشاب کے بازار ہوتے ہیں یا شیرانوالہ گیٹ لاہور سکول کے کمرے، میدان اور باغیچے وغیرہ وغیرہ۔ خوابوں پر کس کا بس ہوتا ہے؟ اسی طرح وطن کی محبت پر بھی کسی کا بس نہیں ہوتا اور جن کا بس ہوتا ہے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے، کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ اپنے وطن سے محبت کم کردیں اور کسی دوسرے ملک کو اپنا وطن بنا لیں۔ بے شک آپ کے وطن نے آپ کو بہت کچھ نہ دیا ہو اور دوسرے ممالک نے آپ کی جھولیاں دولت وثروت سے بھر دی ہوں پھر بھی اپنا وطن اپنا وطن ہوتا ہے جس کی یاد دیارِ غیر میں اتنی ستاتی ہے اس کا اندازہ دیارِ غیر میں رہنے والوں کی تحریروں، تقریروں اور گفتگو سے لگانا چنداں دشوار نہیں۔ کبھی بے ساختہ آنسو نکل آتے ہیں، کبھی کسی کی یاد ستاتی ہے تو کبھی کسی کا خیال آتا ہے، کس کو بتائیں کہ ہم نے ایک کار لے لی ہے، ایک بنگلہ بنا لیا ہے، دولت کی ریل پیل ہے۔ دیارِ غیر میں سبھی غیر ہوتے ہیں۔ غیروں کو کیا، آپ دولت میں

کھیلیں یا عسرت سے دوچار ہوں، آپ تنہائی میں ہوں یا بزم آراء ہوں، آپ کا کتنا بڑا دفتر ہے، آپ وہاں کیا کرتے ہیں، یہ سب کچھ آپ کو اپنے پیاروں کو بتا کر ہی مزہ آتا ہے، وہی خوش ہوتے ہیں اور اگر ان میں لاگ بھی پیدا ہو جائے تو غالبؔ کے نزدیک وہ بھی لگاؤ کی صورت ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ جو کچھ ہے ایک گھر ہے، ایک وطن ہے، وہ کسی نے کہا تھا ناں:

East nor west

Home is the best

ہمیں شرق و مغرب سے کیا لینا، ہمارا شرق و مغرب تو ہمارا اپنا گھر ہے، جس کا گھر نہیں وہ کچھ نہیں اور یہ گھر پھیل کر وطن بن جاتا ہے، وطن سے پیار ایک فطری جذبہ ہے۔ جب سرورِ کائنات حضورﷺ مکہ چھوڑ رہے تھے تو وہ آب دیدہ تھے "اے مکہ تیرے باسی مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے" یہ حالت نبی کی تھی جو عین تقاضائے فطرت تھا تو پھر کون اس تقاضائے فطرت سے منحرف ہو سکتا ہے، ہاں بایں ہمہ ایسے اشخاص کی کمی نہیں جو چند سکوں کے عوض وطن کی غیرت اور تقدس بیچ دیتے ہیں، جو وقتی مصلحتوں کے پیشِ نظر ماں دھرتی کا سینہ چاک کردیتے ہیں، کتنے ظالم ہوتے ہیں وہ، کتنے سفاک......وطنِ عزیز پاکستان ہمارا وطن ہے، ہمارا گھر ہے اور بیشتر لوگوں کی جنم بھومی ہے۔ آج جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ وطن کی دین ہے، مجھے یاد ہے کہ جب پاکستان بنا تو میرے والدین کتنی بے سروسامانی میں کرنال (بھارت) سے بھاگ کر اپنی جان پر کھیل کر لاہور پہنچے تھے جب وہ کرنال سے روانہ ہوئے تھے تو ان کے پاس صرف بس کا کرایہ تھا، لبوں پر اللہ کا نام تھا، لیکن مجھے اور میری بڑی بہن کو یہ کہا جا رہا تھا کہ ہم اپنے باپ کو "پِتا" اور ماں کو "ماتا" کہیں، منہ سے کہیں اللہ نہ کہہ دیں اور اگر کسی ہندو یا سکھ کو معلوم ہو گیا تو وہ بس کی بس کا صفایا کر دے گا اور ہم سب ختم ہو جائیں گے، پھر پاکستان میں میرے والد نے مجھے، میرے بھائیوں اور میرے بچوں کو کیا کچھ نہیں دیا، متحدہ ہندوستان میں ہماری تمام تر کوششوں اور تعلیم کے باوجود یہ سب کچھ مل پاتا؟ سب کچھ انگریز بادشاہ اور بنیا لے اڑتا۔ وہ لوگ جو قیامِ پاکستان سے قبل

صرف چپڑاسی اور چوکیدار ہو سکتے تھے قیامِ پاکستان کے بعد کیا کچھ بنے، کون نہیں جانتا، قیام پاکستان سے قبل کتنے تھے جنہیں سر چھپانے کیلئے چھت میسر تھی، اب قیامِ پاکستان کے بعد محلات کے مالک ہو گئے، بڑے بڑے کاروباری بن گئے، جاگیردار ٹھہرے۔ آزاد وطن مل گیا، جیسے چاہے رہیے، جو چاہے کیجئے، آپ کا اپنا وطن ہے ہاں، کوئی روک ٹوک نہیں، سوائے اس روک ٹوک کے جو ہم نے خود اپنے آپ پہ لازم کی، کوئی فرنگی نہیں، کوئی بنیا نہیں، کوئی مرہٹہ نہیں، کوئی سکھ نہیں، سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں، مگر بھائی بھائی کا دشمن کیسے ہو گیا؟ بھائی نے بھائی کی عصمت لوٹنا کہاں سے سیکھی، گلا دبانا کس نے سکھایا؟ رات بھر میں امیر ترین بننے کی خواہش کہاں سے در آئی، دفتروں میں رشوت کا آسیب کہاں سے نازل ہو گیا، کاروبار میں خیانت ہی خیانت نے کیسے جنم لے لیا؟ جھوٹ، عیاری، مکاری، قتل و غارت، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور اقربا پروری جیسے گھناؤنے جرائم کیسے پروان چڑھ گئے یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں، غور کرنے کی باتیں ہیں، وگرنہ یہ سب بیماریاں ڈینگی وائرس اور کانگو بن کر ہمیں ڈس لیں گی اور ہماری داستان بھی داستانوں میں باقی نہ رہے گی، قوم عاد اور قومِ ثمود کی طرح، قیصر و قصریٰ کی طرح ہم قصۂ پارینہ بن جائیں گے، کیا یہ جھوٹ ہے، کیا یہ غلط ہے، کیا یہ کسی الف لیلوی کہانی کا حصہ ہے۔۔۔نہیں، بالکل نہیں! بس شاید ہم نشے میں ہیں، ہم پر خمار کی کیفیت ہے، بے عملی کا خمار، بد دیانتی کا خمار، آگے نکل جانے کا خمار، پر آگے کیا ہے؟ کبھی سوچا آپ نے آگے وہ دیس ہے جس دیس سے کبھی کوئی واپس نہیں لوٹا اور جس دیس میں ہمیں بھی سب کچھ چھوڑ کر چلے جانا ہے اور لازماً چلے جانا ہے لیکن شاید ہم نشے اور مدہوشی کی کیفیت میں کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں ہیں، ہمیں کب ہوش آئے گا؟ ہمیں تو ڈرون حملے بھی نہ جگا سکے۔ پڑوسی ملک افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور ہم پھر بھی خواب خرگوش کے مزے لیتے رہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، عالم اسلام کس عذاب میں ہے کون نہیں جانتا۔ کچھ جانتے ہیں مگر انکے پاس کوئی ایسا علاج نہیں جو شفا دے سکے بلکہ ایسا علاج ہے جو بیماری کو بڑھائے چلے جا رہا ہے، جوں جوں دوا کی جا رہی ہے درد بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، شاید اس لئے

بھی کہ ہم حقیقت سے آنکھیں چار ہی نہیں کرنا چاہتے، ہم کبوتر کی طرح بلی کو دیکھنا ہی نہیں چاہتے اورنگ زیب کے جانشینوں کی طرح "ہنوز دلی دور است" کے بلند بانگ نعرے ہی سے خوش اور مطمئن ہیں، ابھی تو صرف میرے پڑوسی کا گھر لٹا ہے میرا تو نہیں لٹا، میرا گھر بہت مضبوط ہے، اسے کون لوٹ سکتا ہے، افسوس صد افسوس، ہم نے تاریخ تو پڑھی مگر سیکھا کچھ نہیں قرآن کی تلاوت کی پر یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ ہم کیا تلاوت کر رہے ہیں، بس ثواب سے جھولیاں بھرتے رہے، حقیقت سے آنکھیں چراتے رہے، نتیجہ یہ نکلا کہ نہ طاقت رہی نہ آبرو، رہ گیا کشکولِ گدائی جس پر ہمیشہ بلکہ ہم سب کو فخر ہے، ہم بغلیں بجا رہے ہیں۔ ہمارے پاس اتنی بیرونی کرنسی ہے، ہمارے کیا کہنے! ہم خوش ہیں کہ ہم دشمنوں کی زبان نہیں پڑھتے، دشمنوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوسوں دور ہیں، وہ ہے جو پلید اور ناپاک، ہم تو بازوؤں سے لڑیں گے، ٹانگیں ماریں گے اور سر پھوڑ دیں گے، کتنے سادہ، کتنے معصوم یا کتنے احمق ہیں ہم لوگ (معذرت چاہتا ہوں) ہمیں کب معلوم ہوگا کہ ہم کیا ہیں، کون ہیں، کہاں ہیں۔

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی اب ہماری خبر نہیں آتی"

لیکن شاید کچھ کچھ آتی ہے، کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے سے آنکھ کھل جاتی ہے، کبھی کبھی کوئی کہتا ہے "جاگتے رہنا بھائیو"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نیند میں خلل آ رہا ہے، لیکن دوستو! اگر ہم سوتے رہے تو یہ مملکتِ خداداد خدا ہم سے چھین بھی سکتا ہے (خاکم بدہن) اور اگر چھن گئی تو کہاں جائیں گے۔ یہ کوٹھیاں یہ بنگلے یہ پلازے یہ ایوان کہاں جائیں گے۔ سوچئے! ذرا سوچئے! خدا کے لئے سوچئے۔۔۔ اپنے بچوں کے لئے سوچئے۔۔۔ سوچئے!

☆☆☆☆

مجھے ہے حکمِ اذاں

اگرچہ بُت ہیں زمانے کی آستیوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لاالہٰ الا اللہ

ایسا کون سا دور رہا ہے، کونسا زمانہ، جس کی آستیوں میں بُت نہ رہے ہوں، علامہ اقبال ہی نے تو کہا تھا،

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوئ سے شرارِ بولہبی

حق و باطل کی آویزش ہمیشہ ایک حقیقت رہی ہے جونہی حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی تو شیطان نے پر پُرزے نکالنا شروع کر دیئے، اسے لگا کہ اس کی اہمیت کم ہونے جا رہی ہے، فرشتوں نے بھی تخلیقِ آدم پر ناک بھوں چڑھایا لیکن وہ تو تھے فرشتے اس لئے خاموش ہو گئے مگر شیطان نے اپنی ہٹ دھرمی کا اظہار یوں کیا کہ اس نے آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کر دیا، سجدے کا حکم آدمؑ نے نہیں اللہ نے دیا تھا اور اسے بے چون و چراں تسلیم کیا جانا چاہیے تھا، کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو شیطان کی کیا مجال تھی کہ وہ انکار کرتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ چاہتا تو ہے مگر کسی کو چاہنے پر مجبور نہیں کرتا، صحیح اور غلط بتا دیتا ہے اور پھر اس کی مشیت یہ ہے کہ ہر ذی حیات اور ذی شعور اپنی مرضی استعمال کرے تا کہ یہ فیصلہ ہو سکے کہ کس کی مرضی حق کے طابع ہے اور کس کی طاغوتی قوتوں کے۔ بس یہی اصول تھا جو اس پر لاگو تھا جو بڑا عبادت گزار تھا، بڑا ہی فرمانبردار لیکن تکبر نے اسے آ لیا اور اس نے اللہ کی حکم عدولی کی، اللہ نے اپنی شانِ بے نیازی سے اسے سب کچھ کرنے دیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے ماننے والے اور اس کے چاہنے والے ابلیس کی چالوں میں نہیں آئیں گے اور ابلیس کو منہ کی کھانی پڑے گی اور ایسا ہوا بھی اور ہو بھی رہا ہے لیکن کچھ یوں ہے کہ اللہ کے چاہنے والوں اور ماننے والوں کی تعداد کم سے کم تر ہوتی چلی جا رہی

ہے، طاغوتی قوتوں کا بول بالا ہے اور طاغوتی قوتیں ہی روز بروز اپنی طاقت میں اضافہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ طاقت، یہ گھمنڈ، یہ حکم عدولی اور تکبر جلد یا بدیر خاک میں مل جانے والا ہے لیکن ایک معینہ وقت پہ ایسا ہوگا، ابھی تو ابتلا و آزمائش جاری ہے، کون ہے جو اللہ کی سنتا ہے اور کون ہے جو شیطان کا چیلا ہے اور اس کی سنتا ہے، اب چونکہ صورتحال بہت مخدوش نظر آتی ہے، اس لئے پھر اعلائے کلمۃ الحق کا وقت ہے، صدائے اذاں بلند کرنے کا وقت ہے، پھر پکارنے کا وقت ہے کہ فلاح کی طرف آؤ، اس کی مانو جو سب سے عظیم ہے، سب سے بڑا ہے۔ اذانیں ہو رہی ہیں، ہوتی رہیں گی لیکن ایسا لگتا ہے کہ سماعتیں مفقود ہو کر رہ گئی ہیں، شاید کسی کو اذان کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی کیونکہ اس سے بلند تر آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں، لوگ اپنے کمروں میں بند ہیں، اپنے دفتروں میں محوِ کار ہیں، فیکٹریوں میں اپنے کام میں مدہوش، کاروبار میں منہمک، اتنا شور ہے کہ کچھ سنائی ہی نہیں دیتا، اذان کی آواز دب گئی ہے اب تو کبھی ٹیلی ویژن پر اور کبھی ریڈیو پر اذان سنائی دے ہی جاتی ہے لیکن یہ وہ اذانیں ہیں جن کے بعد شاید نماز نہیں ادا کی جاتی، بس اذانیں ہیں، شعار کی اذانیں، تشخص کی اذانیں، پیشہ ورانہ اذانیں، علامتی اذانیں، سرکاری اور دفتری اذانیں، ایسی اذانوں کی آواز اگر کسی کو سنائی دے بھی جائے تو یہ آواز اثر سے خالی ہوگی۔ کیونکہ یہ وہ آواز نہیں جو دل سے نکلتی ہے، جو روح سے بلند ہوتی ہے جو کبھی سرِ دار دی جاتی ہے تو کبھی ظالم شہنشاہوں کے سامنے، ظالم نظاموں کے روبرو۔ اذان کی آواز تو بلند کرنا ہی ہوگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ نماز بھی ادا کرنا ہوگی بالفاظ دیگر واعظ و تلقین کرنے والوں کو رول ماڈل بننا ہوگا اور جب تک ایسا نہیں ہوتا تو مؤذن کی اذان محض بےکار اور بےمصرف ٹھہرے گی، محض ایک رسم کی ادائیگی ہوگی، ایک نمائش ہوگی۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

ضرورت اس امر کی ہے کہ اب آوازِ اذان دل سے بلند ہونی چاہیے، روح سے اٹھنی

چاہیے کہ اب تو ظلم کی انتہا ہو گئی ہے اتنا ظلم جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی ، نہ شہری آزادیاں ، نہ مملکتی اقتدارِ اعلیٰ کا احترام ، جس ملک پر چاہے چڑھ دوڑیئے ، جس فرد کو چاہے تہ تیغ کر دیجئے ، اس سے بڑی قیامت ، اس سے بڑا عذاب ، اس سے بڑا آشوب اور کیا ہو سکتا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بے وضو اذانیں دی گئی ہیں اور بے وضو نماز پڑھی گئی ہے ، بظاہر قبلہ رو رہے ہیں لیکن بباطن اور جانے کتنے قبلے تراش لئے گئے ہیں ، کتنے لات و منات آستیوں میں موجود ہیں اور صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اتنی سنگدلی اور اتنے ظلم کی ریت کیسے پڑ گئی ہے؟ انسانی خون اس قدر کیوں ارزاں ہو گیا ہے ، یہ ایک سوال ہے۔۔۔ بہت اہم سوال۔۔۔۔ غالباً بلکہ یقیناً اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ اقدار کا تحفظ نہیں کیا گیا ، روحانیت کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ، اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیا گیا اور ہر دور نے اپنی اخلاقیات گھڑ ڈالیں ، لفظوں سے ان کے معانی چھین لئے ، جمہوریت دہشت گردی ٹھہری ، عالمی انصاف سے مراد عالمی استحصال لیا گیا۔ جی ہاں! جنگ ہو گی ، امن کے لئے ہو گی ، یہ کون سا اصول ہے ، یہ کون سا انصاف ہے جو جنگ کو جائز قرار دیتا ہے ، جو آسمانوں سے آگ برسانے کو برحق سمجھتا ہے ، جس کی نظر میں انسانی جان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ، ایک مرے ، سو مریں ، ہزاروں مریں ، مرتے ہی چلے جائیں ، صبح مریں ، شام مریں ، محض اعداد کا کھیل ہے ، اخبار کی چھوٹی سی خبر ، ٹی۔وی کی چھوٹی سی اطلاع۔۔۔ ابھی کوئی بیس۔ تیس سال پہلے کوئی ایسا واقعہ ہوتا تھا تو سب کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے ، لوگ چیخ اٹھتے تھے ، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ واویلا کرتے تھے ، واویلا تو وہ شاید اب بھی کرتے ہیں لیکن یہ واویلا معمول کا واویلا ہے ، روز کی بات ہے ، کونسی نئی بات ہے۔ تو کیا ہم اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتے ہیں ، کیا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کرۂ ارض میں انسان نہ رہے ، کیا اب ہم سوچنے لگے ہیں کہ بہت جی لئے ، بہت رہ لئے ، بہت ہنس بس لئے ، اب کرۂ ارض پر کسی اور مخلوق کی ضرورت ہے ، اب انسانوں کو صفحۂ ہستی سے نابود ہو جانا چاہیے۔ کیا ظلم کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ باقی رہ سکیں گے ، ان کا وجود قائم رہ سکے گا ، نہیں ، ہرگز نہیں ، ہم عالمی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب ہم اس

خوبصورت کرہ کو جس پر دنیا آباد ہے مٹا دینا چاہتے ہیں ، ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ قیامت کب آئے گی ، اب قیامت برپا کرنے کی ضرورت نہیں جب ہم خود قیامت برپا کر رہے ہیں تو کسی صورِ اسرافیل کی ضرورت نہیں ، کسی موت کے نقارے کی ضرورت نہیں ، اب موت کا نقارہ تہذیب یافتہ اقوام ، ترقی یافتہ ذہنوں ، مغربی سودائیوں اور سیاسی بازی گروں نے اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا ہے اور وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اس نقارے کی آواز ان کی موت کا باعث بھی بنے گی ، یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت صرف بے بسوں کے لئے ہو ، مجبوروں کے لئے ہو ، قیامت تو قیامت ہے محشر تو محشر ہے جو ہمہ جہت ہے ، آفاقی ہے ، ہمہ گیر ہے ، جانے ہم سے پہلے کتنی قومیں مٹ گئیں ، ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا ، لیکن فرق یہ ہے کہ ان پر قیامت آسمان سے نازل ہوئی اور ہم اپنی قیامت ، اپنے اختتام کا خود اہتمام کر رہے ہیں ، ہم خواندہ ہوتے ہوئے ، مہذب ہوتے ہوئے ، تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے۔ ہم اللہ کو موردِ الزام کیوں ٹھہرائیں گے۔۔۔ ہم الزام اپنے سر لیں گے ، مگر یاد رہے قیامت کا نقارہ اسرافیل بجائے یا ہم خود ، یومِ محشر سب کے لئے برپا ہوتا ہے اور یہ یومِ محشر خودکشی کرنے والوں اور دوسروں کو خودکشی پر مجبور کرنے والوں کے لئے کڑا وقت ہو گا ، بہت ہی کڑا وقت ، ایسا وقت ضرور آئے گا ، آ کر رہے گا ، یہ قرآن کا فیصلہ ہے ، ہر دین نے اس کی تائید کی ہے لیکن کیا یومِ محشر اس دھرتی پر بھی برپا ہو سکتا ہے؟ ایسا بھی ممکن ہے کہ اس دھرتی ہی پر ہماری نہ سہی آنے والوں کی آنکھیں دیکھ لیں کہ سچ کا بول بالا ہوا ہے اور جھوٹ کا منہ کالا ہوا ہے ، قیصر و کسریٰ کی پُر حکمت سلطنتیں کیا ہوئیں ، سوویت یونین کا کیا بنا ، اب امریکہ بہادر ہے ، امریکہ بہادر کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں لیکن وہ کون ہیں کہ جنہوں نے امریکہ کو بہادر بنایا ہے ، اس کا سراغ لگانا بھی ضروری ہے ، یقیناً امریکہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے پناہ ترقی کی ، علم و حکمت کو بڑی اہمیت دی ، بڑے بڑے عظیم لوگ سر زمینِ امریکہ میں پیدا ہوئے ، جارج واشنگٹن ، ابراہم لنکن اور پھر جانے کون کون تھے جنہوں نے حق کی آواز بلند کی ، جنہوں نے غلامی کو مٹایا ، لیکن یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب کسی فرد یا قوم کے پاس بے انتہا قوت آ جاتی ہے

تو اس کا اخلاقی دیوالیہ نکل جاتا ہے اور یہ بے پناہ قوت اس وقت آتی ہے جب دوسری اقوام اور دوسرے لوگ وقت کا ساتھ نہیں دیتے۔ آج سے بیس، تیس سال قبل صورتحال ایسی نہ تھی۔ تیسری دنیا کو علم حاصل کرنے سے کس نے روکا تھا؟ ان میں جذبۂ محنت کس نے ختم کیا تھا؟ مسلمان تو جانتے تھے کہ علم کا حصول ان پر فرض ہے لیکن انہوں نے اس فرض کو فراموش کر دیا اور داد عیش دینے لگے یہی حال بعض دوسری اقوام کا ہوا لیکن جن ممالک نے ایسا نہیں کیا وہ جرمنی بن گئے، جاپان بن گئے، چین بن گئے، اور ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے بھی سائنس اور ٹیکنالوجی میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے ہم نے علم سے روگردانی کی، ہم نے سیاست کو استحصال، جبر اور بے انصافی کا مجسمہ بنا دیا، رول آف لاء (Rule of law) ختم ہو کر رہ گیا، ہر شخص نے قانون کو ہاتھ میں لے لیا، نیکی کی نصیحتیں کرتے رہے مگر خود نیک نہ بن سکے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اذانِ حق دلوں سے بلند کی جائے، روحوں سے بلند جائے اور ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ بنے۔ افراد قوم بناتے ہیں، قومیں بنی بنائی اور گھڑی گھڑائی آسمان سے نازل نہیں ہوتیں، قومیں مشترکہ مقصد، مشترکہ نظامِ حیات، مشترکہ آرزوؤں اور مشترکہ تمناؤں سے جنم لیتی ہیں اور اس اشتراک میں ہر فرد، بڑا، بوڑھا، بچہ، عورت اور ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں، اس حقیقت کو جس قدر جلد تسلیم کر لیا جائے بہتر ہے اور بقا کی کوئی نئی صورت نکل سکتی ہے ورنہ
"ہماری" داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

☆☆☆☆

یہ کافر دل نہیں مانا

دل اعضائے رئیسہ میں سے ایسا عضو ہے جسے جسم و جاں کا شہنشاہ کہیے تو غلط نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ دل سارے جسم پر، خیالات و افکار پر، جذبات و محسوسات پر ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی عضو بھی پر نہیں مار سکتا۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ دل تو محض خون کو جسم کے مختلف حصوں میں پہنچانے کا ذریعہ ہے اور اس سے احساسات و جذبات کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں، اگر ہم اس بحث میں پڑ گئے تو ہزاروں نظموں، غزلوں اور گیتوں کا کیا بنے گا، ہزاروں کتابیں بے مصرف ٹھہریں گی اور ہزاروں محفلیں اجڑ جائیں گی، ہم تو دل کو دل ہی کہیں گے، جیسے ہم چاند کو چاند کہتے ہیں بھلے لاکھ آرمسٹرانگ اور اس کے ساتھی وہاں ہو آئے ہوں اور اس کی حقیقت کو جان آئے ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہمارا دل جو کہتا ہے کہ چاند چاند ہے کیونکہ جو ہمارے ذہن میں چاند کا تصور ہے اگر ہم اس تصور سے صرفِ نظر کر لیں تو ہم اپنے محبوب کے حسن کے بیان کے لئے کونسا استعارہ تراشیں گے، کچھ اور بھی استعارے ہیں لیکن چاند کی بات ہی کچھ اور ہے، اسی طرح ہمارے دل کی بات بھی کچھ اور ہے اگر اس میں خدا کا گھر بن جائے، اگر وہ حق کی آماجگاہ ہو، معصومیت کا گہوارہ ہو، سچائی کا مسکن ہو تو پھر کرشمے سرزد ہو جاتے ہیں ہمارے نبی اکرمؐ کی زندگی اور صحابہ کی زندگیاں منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انہوں نے اپنے دل کی سنی، اپنے ضمیر کی سنی خدا کی سنی کیونکہ ان کا دل گواہی دیتا تھا کہ "کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے" جی ہاں وہی تو ہے جس نے ہمیں اشرف المخلوقات بنا دیا، ہمیں انسان بنا دیا، جس کے سامنے اللہ کی اعلیٰ مخلوق کو سجدہ ریزہ ہونا پڑا اگر یہی دل اگر طاغوتی قوتوں کی آماجگاہ بن جائے تو بڑی تباہیاں لاتا ہے، عالمی جنگیں برپا کر دیتا ہے، وہ استعماری قوتوں کا آہنی پنجہ بن جاتا ہے اور زندگی پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے۔
میرؔ نے کہا تھا!

دل کہ یک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

غالبؔ نے کہا تھا

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

یا پھر

میری قسمت میں غم گر اتنے تھے
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

اگر ہم دل کے حوالے سے شعروں کا انتخاب پیش کریں تو جانے کتنی کتابیں مرتب ہو جائیں گی، لیکن ہم شعروں کے انتخاب کی بات نہیں کرتے کہ کہیں ہم رسوا نہ ہو جائیں، ہاں! ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ دل بڑے بڑے کام کر جاتا ہے۔ کبھی فرعون، کبھی نمرود، کبھی شداد اور کبھی دورِ حاضر کی استحصالی اور استعماری قوتوں کا روپ دھار لیتا ہے، دل کی نیک خوئی اور بدخوئی کا تعلق نہ رنگ سے نہ نسل سے، نہ مشرق سے نہ مغرب سے، نہ تو نگر سے نہ مفلس اس کا تعلق تو گھریلو تربیت سے ہے، اساتذہ کی نظرِ کرم سے ہے، والدین کی شفقتوں سے ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی بات سن لیتے ہیں جس سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے اخبارات وجرائد اور ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع دل خوش کن خبروں کو کم جگہ دیتے ہیں اور دل کو دہلانے والی خبروں پر مرمٹ جاتے ہیں۔ اب بھی کتنے ایسے لوگ ہیں جو دن رات خدمتِ خلق میں منہمک ہیں کتنے ہیں جو اعلائے کلمۃ الحق میں محو ہیں، کتنے ہیں جو اچھے اساتذہ ہیں، اچھے اہلکار ہیں، اچھے دستکار ہیں، مزدور ہیں اور عمدہ کارکن ہیں لیکن ان کی کوششیں کبھی اخبارات کی شہ سرخیاں نہیں بنتیں، ان کی تصویریں نہیں چھپتیں، شائد انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں لیکن انہیں تو اس کی ضرورت ہے جو سمجھ بیٹھے ہیں کہ دنیا میں صرف لٹیرے ہی رہ گئے ہیں قزاق ہی باقی ہیں، دھوکہ اور فریب دینے والے

ہی موجود ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں رہی، مانا کہ طاغوتی قوتیں بڑی خون آشام ہیں اندھیرے تاحدِ نظر پھیل چکے ہیں، اجالے سمٹتے جا رہے ہیں لیکن روشنی کی ایک کرن، امید کا ایک جگنو، آرزو کا ایک ستارہ، خدمتِ خلق کا ایک چراغ، ہمدردی کی ایک قندیل بھی اتنی قوت عطا کر سکتی ہے کہ افسردہ دل توانا ہو جائیں اور اندھیروں کے خلاف صف آرا ہو جائیں، مانا کہ برائی اور بدعملی بڑے زرق برق لباس میں بزم آراء ہوتی ہے، ایسے ایسے دل کش بھیس بدلتی ہے کہ اس کے سامنے بڑے بڑے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہے، ایسی آنکھیں بھی موجود ہیں جو اس مصنوعی خوبصورتی کا نقاب پارہ پارہ کر سکتی ہیں اور اس کے پار دیکھ سکتی ہیں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا، جسے ہم نے کافر دل کہا وہ بھی ان طاغوتی قوتوں کے خلاف علم حق وصداقت بلند کر سکتا ہے، یہ کافر دل اس لئے کافر ہوتا ہے کہ یہ ہر برائی کا منکر ہو جاتا ہے، طاغوتی قوتوں کے خلاف صف آراء ہو جاتا ہے، اسے لوگ کافر گرداننے لگتے ہیں، یہ اس وقت ہوتا ہے جب اقدار درہم برہم ہو جاتی ہیں، جب لوگ اندھیروں کو اجالوں سے مماثل قرار دینے لگتے ہیں، جب جبر کو پوجا جانے لگتا ہے جب جھوٹ ہی کو اصولِ حیات بنا لیا جاتا ہے، تقسیمِ برصغیر کے دوران بڑی بڑی شخصیات پیدا ہوئیں، ایسی شخصیات جنہیں سونے کے ترازو میں تولا جا سکتا ہے، ان میں سے ایک وہ بھی تھے جنہیں پورے ہندوستان کا گورنر جنرل بنانے کی پیش کش ہوئی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا، ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ہمارے سب سے بڑے رہنما محمد علی جناحؒ تھے جنہیں کوئی خرید نہیں سکا تھا، جھکا نہیں سکا تھا۔ ایسا شخاص اور ایسی صورتیں اب بھی موجود ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حق کو حق کہنا سیکھیں، اچھائی کا پرچار کریں، اچھے لوگوں کی قدر کریں اور الیکٹرانک میڈیا ایسی شخصیات کو سامنے لائے جو بے شک دنیاوی اعتبار سے بڑے قد کاٹھ والے نہ ہوں لیکن اخلاقی طور پر انہیں قد آور اور عظیم کہا جا سکتا ہو ایسے لوگ ہمارے گلی کوچوں، شہروں اور دیہات میں مل جائیں گے۔ کافر دل کے حوالے سے اگر میں اپنی ایک غزل کے چند اشعار تحریر نہ کروں تو میں اپنے (کافر دل) سے زیادتی کا مرتکب ہوں گا۔

کسی نے لاکھ سمجھایا، یہ کافر دل نہیں مانا
مجھے خود بھی خیال آیا، یہ کافر دل نہیں مانا
دلوں کی اپنی منطق ہے دلوں کو کون سمجھائے
پلٹ جاتی مری کایا یہ کافر دل نہیں مانا
کہیں تو ہجر کے جلتے سفر میں مل ہی سکتا تھا
کسی دیوار کا سایہ یہ کافر دل نہیں مانا
ہزاروں اور منظر تھے تمہارے حُسن سے بڑھ کر
نظر کا جی بھی للچایا یہ کافر دل نہیں مانا
رہِ عشق و محبت میں اسے کچھ بھی نہیں سوجھا
شِکم نے ہر ستم ڈھلیا یہ کافر دل نہیں مانا

اور لگے ہاتھوں ایک پنجابی نظم "دل کافر" بھی ملاحظہ کر لیجئے آپ بھی کیایاد کریں گے۔

دل کافر دیاں وکھریاں ریتاں وکھرے صوم صلوٰۃ
دل کافر کدے مومن ہویا! چڑھ گیا سولی تے
دل کافر کدے گوڈے ٹیکے! پی گیا زہر دا جام
دل کافر نے اپنی کیتی بوجھڈے تخت تے تاج
دل کافر دی اپنی دنیا جس تے اوس دا راج

☆☆☆☆

کفرانِ نعمت

اللہ نے ہمیں جتنی نعمتیں دی ہیں ان کا شمار بھی کارِ محال ہے، گنیے تو گنتے چلے جایئے، سوچیئے تو سوچتے چلے جایئے، خود اپنے بارے میں غور کریں تو ہم حیرت زدہ ہو جاتے ہیں، یہ ذہن رسا جس نے محیرّ العقول کارنامے سر انجام دیے اسی کی دَین ہے جس نے ہمیں بے پناہ قوتوں سے نوازا۔ ہم ان کے لئے اللہ کا کتنا شکر ادا کرتے ہیں؟ یہ ایسا سوال ہے جس پر ہمیں غور کرتے رہنا چاہیے اور میری رائے میں ان نعمتوں سے متمتع نہ ہونا بھی کفرانِ نعمت تصور کیا جائے گا، اگر ہم آنکھ کو بے کار رکھ چھوڑیں تو اس سے بڑا کوئی جرم نہ ہوگا اگر ہم دماغ کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لائیں تو ہم قصوروار ٹھہریں گے، المختصر جو بھی صلاحیت ہمیں ودیعت ہوئی ہے اسے استعمال میں نہ لانا جرم قرار دیا جانا چاہیے اور اس کا غلط استعمال تو گناہ کبیرہ متصور ہوگا یعنی جس کام کے لئے ہمیں کوئی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے اسے غلط کاموں میں استعمال کیا جائے اسے شترِ بے مہار بنا دیا جائے اور اس پر کوئی اخلاقی قدغن موجود نہ رہے، وہ طاغوتی قوتوں کی میراث بن جائے تو سوچیئے یہ کتنا بڑا پاپ ہے، کتنا بڑا گناہ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑی نعمت ہمیں دی ہے وہ زبان کی ہے۔ میں ایک کتاب میں Phonetics اور Phonology کے بارے میں پڑھ رہا تھا، مجھے اندازہ ہوا کہ آواز کے زیر و بم اور آوازوں کی ہم آہنگی ہی نے ہمیں انسان بنایا ہے، اگر ہم اپنا مافی الضمیر نہ بیان کر پائیں تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق ہوگا، ایک چھوٹا بچہ جب آں آں اور غوں غوں کرتا ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے اور یہ توقع ہوتی ہے کہ یہ آں آں اور غوں غوں لفظوں اور جملوں میں ارتقاء پذیر ہوگی اور ایک وقت آتا ہے کہ وہی بچہ جو کچھ چاہتا ہے وہی کچھ کہہ لیتا ہے اور جو گفتگو کوئی اور کرتا ہے سمجھ لیتا ہے تو سوچیئے کہ زبان کے استعمال کی استعداد اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، کتنا بڑا احسان ہے اس ذاتِ بے ہمتا کا۔ لیکن ہم نے زبان کے بے محابہ استعمال کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں، ہم تمام دن جانے کیا کیا کہہ رہے ہوتے ہیں اور کیا کیا

لکھ رہے ہوتے ہیں اور یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اس نعمتِ غیر مترکبہ کا استعمال کتنی احتیاط سے کرنا چاہیے، اس زبان کے استعمال سے جانے کتنوں کے دل پارہ پارہ کر دیتے ہیں، کتنوں کے دماغوں پہ بجلیاں گراتے ہیں اور کتنے ہنستے مسکراتے چہروں کو اداس اور پژمردہ کر دیتے ہیں، الفاظ کی مدد سے سازشوں کے کتنے جال بنتے ہیں اور اس طرح عدل و مساوات اور بھائی چارے کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتے ہیں، دولت میں کھیلنے والے اپنی دولت کی فراوانی کے حق میں فصاحت و بلاغت کے زور پر اپنی خوشیوں اور دوسروں کی محرومیوں کا جواز پیش کر دیتے ہیں، کہہ اٹھتے ہیں" اللہ کی دین ہے اس نے ہمیں اتنی بڑی دولت دے دی کسی کا اس پر کیا حق ہے یہ غریب لوگ تو جلتے ہیں، حاسد ہیں اللہ ان سے خوش ہوتا تو انہیں بھی دولت سے نواز دیتا" اسی طرح بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر لینے والے، ناخواندہ لوگوں کا تمسخر اڑاتے ہیں، ان پر پھبتیاں کستے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر وہ فروغِ علم میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہے ہیں تو ان کی ڈگریاں بے مصرف اور بے کار ہیں بلکہ ان کا حصولِ علم ہی کسی کام کا نہیں، حکم یہ ہے کہ اگر تمہیں ایک اچھی بات بھی معلوم ہو تو دوسروں تک پہنچاؤ، دوسروں کو پڑھاؤ، زیورِ علم و ہنر سے آراستہ کرو، لیکن محض ڈگریاں حاصل کرنا اور ان پر اترانا ایک تجاہلِ عارفانہ سے کم نہیں، بلکہ ایک جرم ہے، ایک ایسا جرم جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری صحت اللہ تعالی کی نعمت ہے اس کا کرم ہے لیکن اگر صحت مند آدمی کسی بیمار کے کام نہیں آتا تو اس کی اپنی صحت کسی طرح بھی لائقِ تحسین نہیں ہو گی، حسین وہ ہے جو دوسروں کو حسین بنا دے، عالم وہ ہے جو دوسروں تک علم پہنچائے، دولت مند وہ ہے جس کی دولت سب کے کام آئے، بڑا وہ ہے جو چھوٹوں کو ساتھ لے کر چلے، بزرگ وہ ہے جو چھوٹوں پر شفقت کرے، خدا اس لئے خدا ہے کہ وہ سب کا رزق رساں ہے، انسان اسلئے انسان ہے کہ وہ انس و محبت کا پیکر ہے اور اگر اس میں یہ صلاحیتیں نہیں تو یہ سب کچھ بے کار ہے، سعیِ لا حاصل ہے ۔ ہماری رائے میں معاشرے کو تقسیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورتیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں، سب کے دکھ درد باہمی ہوتے ہیں، خوشیاں وہی ہوتی جس میں سب شریک ہوں، اس لئے یونانیوں

نے انسان کو معاشرتی حیوان کہا تھا، یعنی یہ کہ حیوان اگر معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو تو انسان بن جاتا ہے وگرنہ نرا حیوان رہتا ہے، افسوس! صد افسوس کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی شعور، شعور نہ بن سکا، شعور سے وہ کام نہ لیا جا سکا جس سے زندگی خوشگوار ہو سکتی، ہر ایک انسان پُر امن اور پر سکون رہ سکتا، ہر ایک کا چولہا جل سکتا، ہر ایک کے سر پر چھت ہوتی، ہر ایک اپنا تن چھپا سکتا، ہر ایک کہہ سکتا کہ یہ ساری زمین اللہ کی دین ہے کسی ایک کی ملکیت نہیں، کسی طاقت کے زیرِ نگیں نہیں، کسی مذہب اور کسی فرقے، کسی ذات اور کسی برادری کی نہیں بلکہ انسانوں کی زمین ہے اور اس کی دَین ہے جو رب العالمین ہے۔ کاش کہ ہمارا علم، ہماری دولت، ہماری جسمانی قوت اور ہمارے دل و دماغ کی صلاحیتیں انسانی فوز و فلاح کیلئے استعمال ہوتیں اور ہم اپنے ذرائع کا ۸۰ فیصد حصہ ایک دوسرے کو شکست دینے پر خرچ نہ کرتے، ایک دوسرے کو زیرِ نگیں کرنے پر استعمال نہ کرتے، کسی کو اپنا غلام بنانے میں راحت محسوس نہ کرتے کسی کو اس کے حق سے محروم کر کے بغلیں نہ بجاتے۔ کاش یوں ہوتا، یوں نہ ہوتا، یہ کاش ایک خواب ہے، خواب دیکھنا کوئی بُری بات نہیں اور خواب نہ دیکھنا ہمارے بس میں بھی نہیں، ہاں خواب کی تعبیر کیلئے کوششیں کی جانی چاہئیں تھیں اور کوشش کی جانی چاہئیں یہی ان نعمتوں کا صحیح استعمال ہو گا جو ہمیں عطا ہوئی ہیں ۔

☆☆☆☆

قندِ مکرّر

گزشتہ شمارے میں کچھ ایسی باتیں ہو گئیں کہ کئی احباب کو اچھی نہیں لگیں، کچھ نے کہا ”بڑے قنوطی ہو گئے ہو، زندگی کا ایک ہی رخ دیکھنے لگے ہو“ کسی نے تحریر کیا ”زندگی ہے ہی بے تکی تو پھر اس پر واویلا کیا کرنا“۔ لیکن بہت سے احباب نے میری گفتگو کو بڑی سنجیدگی سے لیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ میں نے اس بار یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ سے اس طرح گفتگو کروں جیسی آپ گزشتہ شمارے میں پڑھ چکے ہیں، لیکن اس بار میں اپنے ایک دوست کو متعارف کرانا چاہتا ہوں۔ دراصل بے تکی باتیں میں نے بڑی حد تک اس سے سیکھی ہیں۔ وہ کمال کا دوست ایسے دلائل دیتا ہے کہ انسان حیران و ششدر ہو جاتا ہے، اس کے سامنے جتنے چاہیں دلائل دیجئے، اس کی اپنی منطق ہوتی ہے اور وہ کبھی کسی کے دلائل سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا، نام اس کا ”سیماب لاہوری“ ہے اور اس نے طبیعت بھی سیمابی پائی ہے، معلوم نہیں کہ اس کی سیمابی طبیعت اس کے نام کی عطا ہے یا اس کی سیمابی طبیعت کے باعث اس کے والدین نے اس کا نام سیماب رکھ دیا تھا۔

اُف! یہ میں کیا کہہ گیا ---- پیدائش کے وقت یہ کہاں پتا چلتا ہے کہ طبیعت کیسی ہوگی، لیکن والدین کو اپنی طبیعت کا پتا ہوتا ہی ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کا بچہ سیماب صفت نکلے گا، چنانچہ شاید انہوں نے اس کا نام سیماب اسی وجہ سے رکھ دیا تھا، ویسے نام میں کیا دھرا ہے، اصل بات تو کام کی ہوتی ہے اور کام بھی کسی کام کا ہونا چاہیے، یونہی بندر کی سی دوڑ نہیں ہونی چاہیے جیسی کہ ہمیں اپنے وطنِ عزیز میں دکھائی دیتی ہے، اُف چھوڑیئے میں کہاں کھو گیا ------ میں تو سیماب لاہوری کی بات کر رہا تھا جو سیماب سے سیماب لاہوری بن گیا تھا جب کہ وہ پلا بڑھا سرگودہا میں ہے اس کے والدین بھی سرگودہا ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہ لاحقہ کیوں استعمال کیا ہوا ہے تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا ”تو کیا ہوا

کسی بڑے شہر سے نسبت رکھنا کوئی بُری بات ہے! اور پھر تم جانتے ہو کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ گویا پیدا ہی نہیں ہوا۔ بھائی ہمیں پیدا بھی ہونا تھا اور مشہور بھی ہونا تھا، لوگوں کی نظروں میں بلند ہونا تھا اور ارادہ یہ بھی تھا کہ شعر کہیں گے ساتھ لاہوری کا لاحقہ کتنا اچھا لگے گا، شاعری تو قدرت کی دین ہوتی ہے اس دین سے تو ہم محروم رہے مگر لاہوری تو مشہور ہو گئے ہیں! کیا یہ کم اعزاز ہے؟“ میں اس کی وضاحت پر مسکرا سا دیا اور کچھ نہیں کہہ پایا۔

تو جناب! یہ میرا دوست اکثر مجھے ملنے آتا رہتا ہے، پڑھا لکھا تو وہ واجبی سا ہے، پر ہے کتاب کا کیڑا، بس انہیں چاٹتا رہتا ہے، اس نے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی جب میں نے اس سے پوچھا کہ تم اتنے پڑھے لکھے ہو تو کوئی ڈگری حاصل کیوں نہیں کر لیتے، اس نے جھٹ سے جواب دیا ”ڈگری لے کر کیا کر لوں گا، ان ڈھیر سارے سچی جھوٹی ڈگریوں والوں نے کیا کر لیا ہے، ارے یار ڈگری لینا کوئی مشکل بات نہیں ہاں پڑھنا لکھنا بہت مشکل ہے، یہ مشکل میں نے آسان کر لی ہے۔ کبھی کتابیں پڑھتا ہوں تو کبھی تم جیسے کم عقل لوگوں کو پڑھتا ہوں“ تم نے مجھے کم عقل کہہ دیا اتنے عقل مند ہو تو مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے ملک میں اتنی پریشانی، اتنی افسردگی، بے چینی اور ہیجان کیوں ہے؟ رات کا آرام گیا دن کا چین، جانے کب موت کا فرشتہ آ جائے، خیر فرشتہ تو پہلے بھی اچانک ہی آیا کرتا ہے اب اس کے اچانک پن میں بلا کا اضافہ ہو گیا ہے، بھلا بتاؤ ایسا کیوں ہو گیا ہے۔ اس نے کہا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں، اس کی وجہ تو صاف ہے، میں نے کہا، کیا؟ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم خود اس کے ذمہ دار ہیں ہم خود جان بوجھ کر ان پریشانیوں میں مبتلا ہیں یہ میں نے کب کہا۔ میں عزیزانِ وطن کے لئے اس طرح کبھی سوچ بھی نہیں سکتا، دیکھو نا! ہمارے تو سارے پاکستانی کتنے اچھے ہیں، کوئی تین ساڑھے تین لاکھ لوگ ہر سال حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور عمرہ کرنے والوں کا کوئی حد و شمار ہی نہیں۔ دیکھو! کتنی مساجد آباد ہیں لوگ دین دار ہیں نا، ایک ایک محلے میں چار چار مساجد، بڑی عالیشان مساجد، اس سے ان کی دین کے ساتھ محبت کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سے بہت سے باقاعدہ اہتمامِ رمضان کرتے ہیں اور اگر کسی کو

کھاتا پیتا دیکھ لیں تو اس کا بھرکس نکال دیتے ہیں کیا مجال کسی کے گھر سے دھواں باہر نکل رہا ہو وہ روزہ خوروں کو کبھی معاف نہیں کرتے ،دیکھو نا! اتنے اچھے لوگوں کو بُرا کہنا ،بد دیانت کہنا ،ظالم کہنا ، ذخیرہ اندوز بتانا کتنی عجیب سی بات لگتی ہے ۔وہ کبھی ایسی خرابیوں میں ملوث ہو ہی نہیں سکتے'' وہ بولتا چلا جا رہا تھا ،میری ہنسی نکل گئی ،یار کمال کرتے ہو ،'' تو یہ سب کچھ کون کرتا ہے؟'' تمہیں نہیں معلوم '' نہیں مجھے نہیں معلوم'' تبھی تو تم سے پوچھ رہا ہوں اور تم نہیں جانتے یہ سب ایجنسیوں کا کام ہے ،میرے بھائی! یہ سب کچھ خفیہ ہاتھ کر رہے ہیں اور سنو! کچھ مافوق الفطری عناصر بھی اس زبوں حالی کے ذمے دار ہیں ،میں نے سنا ہے کئی جن بھوت یہ کام سرانجام دیتے ہیں ،انہوں نے بڑے بڑے گودام بنا رکھے ہیں ،کبھی چینی چرا کر وہاں رکھ لی تو کبھی آٹا ،کبھی گھی تو کبھی پٹرول ۔میری طرف کیا دیکھ رہے ہو ،حیران کیوں ہو ،یہی کچھ تو ہو رہا ہے وگرنہ عزیزانِ وطن یہ حاجی ،یہ نمازی بھلا کوئی برا کام سرانجام دے سکتے ہیں؟ ایسی برائیوں میں ملوث ہو سکتے ہیں؟ میں نے کہا تو ایسا صرف پاکستان میں کیوں ہے یہ ایجنسیاں ،یہ خفیہ ہاتھ یہ بھوت پریت کسی اور ملک میں برسرِ عمل کیوں نہیں''، '' بس یار چھوڑو سب ہماری معصومیت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ،ہم بے چارے معصوم سے لوگ ہیں ،سادہ دل ،سادہ لوح تمام زمینی اور آسمانی تخریبی قوتیں ہماری معصومیت اور سادگی سے کھیلتی ہیں ۔میں حیران تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن اس کی کسی بات کو کاٹنا ،اس کے سامنے کوئی دلیل دینا ،کوئی آسان نہیں تھا ،اس لئے میں خاموش ہو رہا ۔مجھے معلوم ہے کہ سیماب لاہوری جیسے جانے کتنے افرادِ وطنِ عزیز میں موجود ہیں جنہیں اپنی آنکھ کا شہتیر کبھی نظر نہیں آتا دوسروں کی آنکھ میں تنکا تلاش کر لیتے ہیں ،جو کسی عمل کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتے ، سوچتے ہیں کہ ہمارے بس میں یہی ہے کیا! ہم بے چارے مجبور ،لاچار لوگ ہیں ،سادہ لوح ،سادہ دل ،بس کچھ سخت دن آئے ہوئے ہیں ٹل جائیں گے ،جب موسم سرما آتا ہے تو اس کے بعد بہار بھی آتی ہے ،بس آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ کوئی غیبی طاقت آ کر ہمارے مسائل حل کر دے گی ، ہماری مشکلات ختم ہو جائیں گی اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں وہ اتنے غلط بھی نہیں جن کی تعلیم و

تربیت ہی اس انداز سے ہوئی ہو کہ ان کی خودی خاک میں مل گئی ہو ،اور جو کہتے ہوں ۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

اور جو سوچتے ہوں کہ دیکھنے کیلئے آنکھیں بند کرنا ضروری ہیں اور سننے کیلئے کانوں پر تالے لگا دینا لازمی ہیں اور اچھی سوچ کے لئے سوچ سے لاتعلق ہو جانا ہی غور و فکر کا واحد ذریعہ ہے ،جس قوم پر ہزار سال بادشاہت نے ظلم توڑے ہوں یا جنہیں صرف اللہ کے حوالے چھوڑ دیا گیا ہو اور بادشاہ محلات میں دادِ عیش دیتے رہے ہوں اور پھر جن پر بیرونی قوتوں نے تسلط جما لیا ہو اور ان سے ان کی عزت اور غیرت سب کچھ چھین لی ہو اور پھر ایسا جاگیردارانہ نظام قائم کر دیا ہو کہ ان کی خودی کبھی بلند نہ ہونے پائے ،ان میں کبھی آزادیٔ فکر جنم نہ لے پائے تو پھر بھی ایسی قوم فکر و عمل سے عاری نہ ہوگی تو کیا ہوگا ۔پھر یوں لگنے لگتا ہے کہ سیماب کی سوچ درست ہی ہے جب آپ کو سچ بولنے کی اجازت ہی نہ ہو ،جب آپ اپنے ضمیر کا اظہار ہی نہ کر سکیں یا پھر آپ میں سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کی صلاحیت ہی نہ پیدا ہو پائے ،آپ دن کو دن اور رات کو رات نہ کہہ سکیں تو پھر آپ یہی کہیں گے کہ سارا کام ایجنسیوں کا ہے ،خفیہ ہاتھوں کا ہے ،مافوق الفطری قوتوں کا ہے ۔کیونکہ اگر آپ نے سچ بولا تو آپ کی زبان کھینچ لی جائے گی ،اگر سر بلند کیا تو سر قلم ہو جائے گا ،سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنے لگے تو زندگی اور موت کا امتیاز ختم ہو جائے گا ۔یہ جاگیردار ، یہ وڈیرے یہ سرمایہ دار سیماب جیسے افراد ہی کو جنم دے سکتے ہیں ۔اس لئے ایسے سادہ لوگوں کا کچھ زیادہ قصور نہیں تو پھر قصور کس کا ہے؟ کچھ میں نے عرض کر دیا کچھ آپ جانتے ہیں شاید ہم سب جانتے ہیں لیکن ہمارا جاننا کافی نہیں ،ہمارا علم بے کار ہے ،ہمارا شعور فضول ۔جب تک کہ ہم اپنے علم ،اپنے شعور اور اپنی آگہی کو اتنا توانا نہ بنائیں کہ ہم فرعونِ بدیں کے حسین کی طرح ،علی وجودی کے سینے پر بیٹھ کر اس کی تکہ بوٹی نہ کر دیں ،ایسا وقت آتا ہے ،ضرور آئے گا ،آ کر رہے گا ،کیونکہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور خدا کے بندوں کو بھی زیادہ دیر تک بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا ۔

بے سروپا

قارئین کرام! جس جریدے کا پیش لفظ یا حرفِ آغاز کہہ لیجئے یا اداریہ ہی بے سروپا ہو تو اس جریدے کے باقی مندرجات کیسے ہوں گے۔ برائے کرم ایسا مت سوچئے، یہ فیصلہ جریدہ کے تمام مندرجات کا مطالعہ کر کے ہی کیجئے، اس حرفِ آغاز کا تعلق صرف حرفِ آغاز ہی سے ہے، شاید گزشتہ شماروں کے اداریوں میں یا (جو نام بھی آپ دینا چاہیں) کچھ زیادہ سنجیدہ باتیں ہو گئی ہیں۔ خواہش یہ ہے کہ کچھ غیر سنجیدہ باتیں بھی ہو جائیں، مجھے معلوم نہیں کہ غیر سنجیدہ باتیں ہو پائیں گی یا نہیں۔ بہر کیف ارادہ یہی ہے کہ کچھ غیر سنجیدہ باتیں ہو جائیں لیکن پھر وہ حضرت علیؓ کا قول یاد آ جاتا ہے کہ "میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا" لیکن ہماری رائے میں ہمارے تمام ارادے ٹوٹنا ضروری نہیں، ایک آدھ ارادے کے ٹوٹنے سے بھی رب شناسی ممکن ہے۔

ہاں! تو میں نے عرض کیا کہ کچھ بے تکی باتیں ہو جائیں، کچھ غیر سنجیدہ موضوعات، کچھ بے محل جملے اور کچھ بے سروپا سطور!

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا کہ مرنے کے بعد گناہ گار عرصہ دراز تک جہنم میں رہتے اور پھر خدا انہیں واپس دنیا میں بھیج دیتا تو کیا وہ پارسا ہو جاتے؟ میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ دنیا میں بھی کئی بار قیامتیں برپا ہوئیں ہیں، جہنم کے مناظر دیکھنے میں آئے ہیں، کشمیر کے ۲۰۰۵ء کے زلزلے ہی کو لے لیجئے یا پھر سونامی کی بات کر لیجئے یا پھر حالیہ سیلابوں کی، کتنے خوفناک تھے یہ سیلاب؟ جس سے عزیزانِ وطن کو دوچار ہونا پڑا، قیامت ہی تو تھی، نیچے پانی، اوپر پانی، دائیں پانی، بائیں پانی، پانی ہی پانی! پانیوں میں قبریں، پانیوں میں عمر بھر کی کمائی اور سب کچھ پانی کی نذر! لیکن اس طوفانِ بلا خیز یا یوں کہہ لیجئے طوفانِ نوح سے جو لوگ

بچ رہے ہیں یا جنہوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کیا ان میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آ جائے گی؟ وہ دیانت دار ہو جائیں گے؟ بد دیانتی کا ملیا میٹ ہو جائے گا؟ خوفِ خدا دلوں میں جنم لے لے گا؟ یہ بہت سے سوالات ہیں، ان کے جوابات آپ تلاش کرتے رہیے، میں بھی تلاش کرتا رہوں گا، لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ انسان عجب شے ہے، کبھی فرشتے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ شیطان کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے، انسانوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں اور طبیعتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔

جانتے ہیں ناں آپ جوناتھن سوئفٹ (Joenthan Swift) کو وہ اٹھارھویں صدی کا پگلا، جو آئر لینڈ میں رہتا تھا، اس نے خیالی سفرنامے تخلیق کئے انسان چھ انچ کے بنا دیئے، چھ انچ کے یہ انسان اتنے ہی تنگ نظر، تنگ دل اور تنگ روح تھے جتنے کہ وہ انسان جو اس نے ساٹھ فٹ کے بنا دیئے تھے، گویا لمبا ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا، چھوٹا ہونے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ سوئفٹ (Swift) کمال کا پاگل تھا، پھر اس نے انسانوں کو گھوڑے اور ریچھ بنا دیا اور کم و بیش ان میں بھی وہی انسانی خامیاں رکھ دیں جو عام طور پر ہوتی ہیں، ہاں گھوڑے قدرے بہتر تھے، لیکن عجیب تھے وہ بھی، نہ کسی کی پیدائش پر خوش ہوتے تھے نہ کسی کی موت پر روتے تھے، ننگے دھڑنگے دوڑتے بھاگتے پھرتے تھے۔ سوئفٹ (Swift) نے اپنے یہ سارے بے تکے کردار شاید غصے میں آ کر تخلیق کئے تھے۔ ایک بار اس نے کہا تھا جب تمہیں کہیں دنیا ملے تو ایک تھپڑ میری طرف سے بھی رسید کر دینا۔ پگلا کہیں کا! دنیا میں تو وہ خود بھی شامل تھا۔

چلئے چھوڑیے! کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر پیدائش کے وقت آدمی بوڑھا ہوتا اور پھر آہستہ آہستہ بچہ تو کیا اس میں بچگانہ صفات پیدا ہو جاتیں، شاید نہیں، شاید ہاں، وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ قارئین اگر گدھوں، گھوڑوں، بھیڑوں، گائیوں اور بھینسوں کو انسانی دماغ مل جاتا اور ان کا آئی کیو (IQ) اٹھانوے ہوتا تو کیا وہ بھی ایسی حرکات ہی کرتے یا ایسے معرکے ہی سر انجام دیتے جیسے کہ ہم انسان دے رہے ہیں۔ چلئے چھوڑیے یہ سب خرافات ہیں، بات انسانوں

کی کی جانی چاہیئے، گھوڑوں یا ریچھوں کی نہیں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر پاکستان کے سب لوگ امیر ہوتے تو کیا کرپشن کم ہوتی یا سب غریب ہوتے تو کیا سب دیانتدار ہوتے کیونکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کئی لوگ دس روپے چُرا کر بھی بغلیں بجاتے ہیں اور کئی لوگ دس ارب روپے ہضم کر کے بھی پریشان ہی رہتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کہیں سے اور مل جائے، ویسے ترقی یافتہ ممالک میں تو بڑی امارت ہے، کم از کم اتنی امارت ضرور ہے کہ جس کے ہم خواب دیکھتے رہتے ہیں اور خواب دیکھتے مر جائیں گے مثلاً یہ کہ وہاں ہر ایک کو ڈاکٹر دستیاب ہے، استاد دستیاب ہے، ٹرانسپورٹ دستیاب ہے، اچھی خوراک اور آب وہوا دستیاب ہے، کیا وہاں کرپشن ختم ہو گئی ہے؟ شاید بڑی حد تک ہو گئی ہے کیونکہ انہیں اچھے پانی اور اچھے کھانے کے ساتھ ساتھ اچھی تعلیم بھی ملتی ہے اچھی تربیت بھی حاصل ہوتی ہے، اچھے رول ماڈلز بھی مل جاتے ہیں، ارے یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ اچھی تعلیم کیا ہوتی ہے، رول ماڈل کیا ہوتے ہیں، اچھی تربیت کسے کہتے ہیں، اس کی مثالیں وطنِ عزیز میں عنقا ہیں، اچھی تعلیم یہاں یہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریاں ہوں اور اچھی تربیت یہ کہ شرفاء میں اندازِ گفتگو اور ہو غرباء میں اندازِ تکلم کچھ اور۔ میری رائے میں، معلوم نہیں مجھے اپنی رائے کو رائے کہنا چاہیے یا نہیں کیونکہ میں اصحاب الرائے میں شامل نہیں ہوں تاہم جسارت کی جا سکتی ہے۔ فرق امیر یا غریب ہونے سے نہیں پڑتا، مغربی یا مشرقی ہونے سے نہیں پڑتا فرق اندازِ فکر سے پڑتا ہے، زاویہ نظر سے پڑتا ہے اور یہ اندازِ فکر اور زاویہ نظر کیسے حاصل ہو، یہ سوال بہت مشکل ہے، خدارا اگر آپ کے پاس اس کا کوئی جواب موجود ہو تو لکھ بھیجئے، ویسے بے تکی باتوں کے بے تکے جواب ہی ہو سکتے ہیں لیکن تک والے جواب بھی قابلِ قبول ہوں گے۔

☆☆☆☆

وراثت اور ماحول کا جبر

ویسے تو جبر، مجبوری، بے بسی، ظلم و تعدّی اور بے اختیاری جیسے الفاظ ہماری گفتگو کا جزوِ لاینفک بنتے جا رہے ہیں، بلکہ بنتے کیا جا رہے ہیں ہمیشہ بنتے رہے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ اپنی کوتاہیوں اور بے عملیوں کو کسی کے جبر سے منسوب کیا ہے اور خود اطمینان کا سانس لیتے رہے ہیں یہاں تک کہ ہمارا سانس ہی بند ہو گیا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ہوتا جا رہا ہے، وراثت اور ماحول کی بحث کچھ اسی طرح کی بحث ہے گو یہ بحث ہم نے نہیں چھیڑی بلکہ سائنسی بنیادوں پر Darvin نے چھیڑی تھی وہ بھی آج سے کوئی ڈیڑھ سو سال قبل، اس نے اپنی تصنیف یا کہہ لیجئے ریسرچ "Evolution of Species" میں ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسان بنیادی طور پر ایک میکانکی عمل کا نتیجہ ہے اور خود بھی ایک طرح کا میکانیزم ہے، وہ کسی آسمانی دنیا کا قائل نہیں تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ سب کا سب ارتقاء از خود ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا، جاندار اپنی ہیئت اور صورت بدلتے چلے جائیں گے، اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ انسان بنیادی طور پر جانور ہے اور اپنی عادات و خصائص کے اعتبار سے مجبور ہے، اس پر اپنے ماں باپ کے اتنے اثرات ہوتے ہیں کہ وہ چاہے بھی تو ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا اور پھر Genetics کے علم نے ثابت کیا کہ ساری کارفرمائی Genes کی ہے، ماں باپ کے Genes ہی بچے میں منتقل ہوتے ہیں اور یہ Genes بڑی جبریت کے حامل ہوتے ہیں، دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ بچہ اپنے ماں باپ کی عادات و خواص کا اظہار کرتا ہے، اس کے قول و فعل میں آپ اس کے والدین کے اثرات دیکھ سکتے ہیں Darvin نے یہ بھی ثابت کیا تھا کہ وراثت کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بڑا ظالمانہ کردار ادا کرتا ہے اور انفرادیت کو پنپنے ہی نہیں دیتا، یہ وہی بات ہے جو Darvin سے پہلے فرانس کا ادیب اور دانشور روسو ـــــ کہہ گیا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر زنجیروں میں جکڑ لیا جاتا ہے۔

یہ صورت حال بادی النظر میں درست معلوم ہوتی ہے لیکن کیا کیجئے ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے شواہد موجود ہیں کہ فرد نے اپنی انفرادیت کو منوا کے چھوڑا ہے، پیغمبروں کو ہی لے لیجئے نہ انہوں نے اپنے والدین کے اثرات کو قبول کیا اور نہ ہی اپنے اپنے ماحول کے اثرات کو۔ ماں باپ کی جینز ان کی راہِ عمل متعین نہیں کر سکے اسی طرح جتنے مصلحین، مدبرین اور سماجی کارکن ہوئے ہیں یا اب ہیں سب نے اپنی راہیں خود چنی ہیں۔ معاشرے نے ان پر ہر ممکن ظلم کیا، ان کی راہیں مسدود کیں، رکاوٹیں ڈالیں اور روڑے اٹکائے لیکن حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے، سقراط نے زہر کا پیالہ نوش کر لیا مگر نظریات نہیں بدلے گلیلیو نے ہر اذیت برداشت کی لیکن ڈگمگایا نہیں۔ ایک گلیلیو اور سقراط پر ہی کیا موقوف، ہر محسوس کرنے اور سوچنے والے فرد نے اکثریت کے جبر کا ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کیا، نفرتوں میں محبتوں کے گیت گائے، اداسیوں میں مسرتوں کے چراغ روشن کئے، شکستوں کو فتوحات میں تبدیل کیا اور تاریکیوں کا سینہ چاک کر کے دھرتی کو بقعۂ نور بنا دیا۔ اپنے شاعروں، ادیبوں ہی کو لے لیجئے، اہلِ خانہ انہیں دیوانہ اور احمق گردانتے رہے لیکن انہوں نے اپنے افکار اور خیالات کے اظہار میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، انگریزی ادب میں Shakespeare نے انگلستان میں ہوتے ہوئے آفاقیت کا پرچار کیا ملٹن نے اپنے عہد کی عیاشی کا بھانڈا پھوڑا اور تازیانے رسید کئے۔ Wordsworth نے شعرو ادب کو نئے زمین و آسمان عطا کئے، یہی کچھ اس کے معاصرین نے کیا اور بعد میں آنے والے شعرا کرتے رہے، ہندوستان میں جہاں تقدیر کا طوطی بولتا تھا، جہاں بے بسی کا دور دورہ تھا، انسان کی بے بسی اور بے کسی کے مظاہرے جگہ جگہ دیکھے جا سکتے تھے، انسان سراپا بے بسی اور مجبوری نظر آتا تھا، اقبال نے اس مجبوری اور بے بسی کے بتوں کو جس طرح پاش پاش کیا اس سے کون واقف نہیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ تقدیر پرست نہ اپنا بھلا کرتے ہیں نہ کسی اور کا، بلکہ اپنی غیر ذمہ داریوں، عیش پرستیوں اور سہل انگاریوں کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اقبال نے اپنی شاعری میں اس سوچ کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور وہ تھپڑ رسید کئے کہ بے بسی اپنا گھناؤنا چہرہ

چھپانے پر مجبور ہونے لگی اور انسان میں ایک نئی زندگی نے جنم لیا۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو ہے آپ ہی تقدیرِ الٰہی

لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کو اپنا شاعر کہنے والے، اپنا محسن گردانتے والے ان کے اشعار پر سر دھننے والے، ان کے کلام کی روح کو ہمیشہ مجروح کرتے رہے ہیں، انہوں نے اپنے شاعرِ مشرق حکیم الامت سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، کچھ نہیں سیکھا۔ ہاں بس سٹیج پر لہک لہک کر، چہک چہک کر ان کے اشعار پڑھتے رہے، ملاں نے بھی اپنی تقاریر کو دھواں دار بنانے کے لئے ان کے اشعار سے استفادہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا مگر سب نے ان کے افکار کا استحصال کیا۔

جیسا کہ احباب جانتے ہیں کہ میں گزشتہ چالیس برس سے شعبۂ تدریس سے منسلک ہوں، میں نے جب بھی اور جہاں کہیں بھی تقدیر کی بات شروع کی تو میرے طلباء اور طالبات نے تقدیر کے پُجاری ہونے کا ثبوت دیا اور میرے خیالات پر بڑی حیرت کا اظہار کیا کسی نے کہا "سَر! آپ کیا کہہ رہے ہیں تقدیر کے خلاف بات کرنا تو گناہ ہے۔ دیکھیں نا۔ سَر! اللہ کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔

سَر! تقدیر کے خلاف بولنا کلمۂ کفر ادا کرنا ہے۔' تو میں نے انہیں بتایا کہ اگر یہ بات ہے تو آپ کے شاعرِ مشرق سب سے بڑے کافر ہیں، مگر میری بات ان کی سمجھ میں کم کم ہی آئی، ہاں جن کی سمجھ میں آ گئی، خوب آئی۔ میں نے ہمیشہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ اگر سب فیصلے ہو چکے

ہیں، تقدیر لکھی جا چکی ہے اور انسان بے بس ہے تو پھر یہ قیامت اور جزا و سزا کا ہنگامہ کیا ہے؟ قرآن پاک میں بار بار کیوں آیا ہے کہ ہر ایک کو اس کے عمل کی سزا اور جزا مل کر رہے گی اور یہ کہ کوئی شخص اپنے عمل کو چھپا نہیں سکے گا اور اس کی پاداش سے بچ نہیں پائے گا، کیا ہمارا خدا اتنا بے انصاف ہے کہ وہ کٹھ پتلیوں سے حساب و کتاب کا روادار ہوگا، ہمیں بے بس بنا کر ہم سے ہمارے عمل کا حساب طلب کرے گا، اگر سب کچھ پہلے ہی سے لکھا جا چکا تھا تو پھر کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ پند و نصائح جو ہم دن رات کرتے رہتے ہیں ان کا آخر جواز کیا ہے۔ تو پھر تو ہمیں جو ہوا ہے یا جو ہو رہا ہے اسے صبر و شکر سے قبول کر لینا چاہیے اور خوش ہونا چاہیے کہ ہم ہر ایک ذمہ داری سے فارغ ہیں اور آزاد ہیں لیکن ایسا ہے نہیں، نہ ہی یہ درست ہے کہ سب کچھ پہلے سے لکھا گیا ہے اور نہ ہی یہ درست ہے کہ وراثت اور ماحول سے مفر ممکن ہی نہیں، ہاں ان کے اثرات سے نبرد آزما ہونا ہی تو ہمارا امتحان ہے، وہ صلاحیتیں جو ہمیں ودیعت ہوتی ہیں، وہی تو وہ امانتیں ہیں جنہیں پہاڑوں نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس میں کلام نہیں کہ وراثت اور ماحول کے ساتھ آویزش بڑی خون آشام، زہرہ گداز اور جان لیوا ہوتی ہے، جان جوکھوں میں ڈالنا پڑتی ہے، کہیں دستار اتاری جاتی ہے تو کہیں گریبان چاک ہوتا ہے، کہیں طمانچے پڑتے ہیں تو کہیں جوتے لیکن ان سب آزمائشوں کے بعد ماحول اور وراثت کا جبر دم توڑ دیتا ہے۔ سارے لات و منات پاش پاش ہو جاتے ہیں اور پھر مرد آزاد، مرد حُر اور مرد آفاقی پیدا ہوتا ہے جو تاریخ کا رخ موڑ دیتا ہے، حالات کا دھارا بدل دیتا ہے، اندھیروں کو اجالوں میں منتقل کر دیتا ہے "مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ" اور ہمیں وہ محنت جو جانور سے انسان بننے کے لئے درکار ہے منظور نہیں، مگر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہمیں انسان بننا منظور ہے یا جانور بننا، یہ فیصلہ ہر فرد پر چھوڑتے ہیں۔

☆☆☆☆

سول سوسائٹی.......ایک ناقابلِ تسخیر قوت

مہذب معاشروں میں سول سوسائٹی کا کردار کسی سے مخفی نہیں، یہ کردار اول اول یونانی اور رومن معاشروں نے ادا کیا تھا، خواندہ، سنجیدہ اور مہذب افراد نے یونان میں معاہدۂ عمرانی کی داغ بیل ڈالی اور روم میں ہر شعبۂ حیات سے متعلق قانون سازی کی۔ یونانی اور رومن تہذیبوں کے زوال کے بعد مسلمانوں نے تو معجزے ہی کر دکھائے، سول سوسائٹی یعنی نبی ﷺ اور ان کے صحابہؓ نے اپنی مثالوں اور اپنے عمل سے ایک مثالی معاشرے کی بنیاد رکھ دی بلکہ بنیاد ہی نہیں ایک عمارت استوار کر دی۔ بعد ازاں باوجوہ حالات خراب ہونے لگے جس کے تجزیے کا یہ موقع نہیں پھر ہم نے تقسیم برصغیر پاک و ہند کے حوالے سے دیکھا کہ مہذب افراد نے مل جل کر وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے پہلے باہمی اتحاد سے اور پھر الگ الگ عوام الناس کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور بھارت اور پاکستان معرضِ وجود میں آئے۔

پاکستان کے حوالے سے کچھ یوں ہوا کہ سال بہ سال صورت حال دگرگوں ہوتی چلی گئی، خواب ٹوٹتے گئے، امیدوں کے محل چکنا چور ہوتے گئے، شرانگیز قوتوں نے اپنی من مانی کرنا شروع کر دی اور معاشرے کو حصوں بخروں میں تقسیم کر دیا۔ کسی کو متمول اور کسی کو تہی دست بنا دیا، کوئی مہذب ظالم بن گیا اور کوئی بے بس مظلوم، کسی کے پاس دولت کی ریل پیل ہو گئی تو کوئی نانِ شبینہ کو ترسنے لگا۔ قانون کسی کا غلام بن گیا تو کسی پر مظالم توڑنے کا ذریعہ استحصالی قوتوں نے جی بھر کے استحصال کیا یہی نہیں بلکہ تہی دستوں نے بھی ایک دوسرے کے حقوق سلب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی دولت مند تو تہی دستوں کے دشمن تھے ہی، تہی دست بھی تہی دستوں کے بیری ہو گئے، ایک کاروباری نے دوسرے کاروباری کو چَل دیا، پٹواری نے استاد کا استحصال کیا، استاد نے طلبا کا، طلبا نے ماں باپ اور ماں باپ نے کسی اور کا۔ گویا شیکسپیئر کے کردار کنگ لیئر کی

زبان میں دھو کے باز سود خور کی گوش مالی کرنے لگا اور یوں ایک چور دوسرے چور کے عیب گنوانے لگا اور پھر کم و بیش حمام میں سبھی ننگے نظر آنے لگے۔

صورتِ حال جب قابلِ رحم ہو جاتی ہے تو قدرت کوئی نہ کوئی سبیل نکالتی ہے، چنانچہ گزشتہ دو تین سالوں سے وکلاء برادری نے اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو مجتمع کیا اور دکھوں کا علاج تلاش کرنے لگے، ان مہذب لوگوں کو بھی گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا لیکن پھر بھی وکلاء کا اتحاد ایک امید کی کرن نظر آنے لگا اور اب بھی ایک حد تک طمانیت کا باعث ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شہر اور ہر گاؤں کے باشعور افراد اپنے حقوق کے حصول کے لئے جمع ہوں اور اپنے فرائض کا فکر بھی کرنے لگیں کیونکہ ادائیگی فرائض کے بغیر حصولِ حقوق بے معنی ہیں۔ سرگودھا میں ایک ایسی ہی کوشش انصاف فاؤنڈیشن کے نام سے نظر آنے لگی ہے۔ شہر کے لوگ جمع ہونے لگے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا تعلق کسی سیاسی اور مذہبی گروہ سے نہیں انہوں نے واضح کیا ہے کہ وہ اپنے ہم نفسوں کو دکھوں سے نجات دلائیں گے کسی پر ظلم نہیں کریں گے اور نہ کسی کو ظلم کرنے دیں گے۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان کی فاؤنڈیشن میں کالی بھیڑوں کے داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں، اگر وہ کہیں سے در بھی آئیں تو انہیں نکال باہر کر دیا جائے گا۔

آج ہمیں ایسی ہی کوششوں کی ضرورت ہے، کہ وعدوں کو ایفا کیا جائے اور زبان دل کی رفیق ہو، عمل اور قول میں تضاد پیدا نہ ہونے پائے، ہمیں یقین ہے کہ خیر کی قوتیں ہمیشہ فتح یاب ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے سر پر ہوتا ہے۔ فاؤنڈیشن کے صدر حافظ عبدالرؤف اور جنرل سیکرٹری میجر شہباز اس حوالے سے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ تنظیم اپنا ایک اخبار بھی نکالنا چاہتی ہے تاکہ نیکی کا یہ جہاد قلم کے ذریعے سے بھی کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر نیت نیک ہو اور نیک رہے تو شر کی ہر قوت دم توڑ دیتی ہے اور خیر کا بول بالا ہی ہوتا ہے۔

نغمے کو نوحہ نہ بننے دیجئے

یوں تو زندگی نغمے اور نوحے، غم اور خوشی، دکھ اور سکھ کا امتزاج ہے اور غم کے بغیر خوشی کا ادراک ممکن ہی نہیں اور خوشی غم کے خوف کے بغیر محال ہے۔ بقول مرزا غالبؔ

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم! مگر تمہید جانے کی

گویا وصل ہی فراق کی ابتداء ہے جیسے پیدائش موت کی، صبح شام کی، آغاز انجام کی، لیکن اگر ہم اپنے پاؤں پہ خود ہی کلہاڑی مارنے لگیں اور اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارتے مارتے دوسروں کو بھی زخمی کرنے لگیں تو پھر پریشانی پیدا ہو گی، غیض و غضب جنم لے گا اور آئین و قانون کی حال دہائی ہو گی۔ ہمیں حق ہے کہ ہم خوشی کے کچھ لمحے گزاریں مگر اس شرط پر کہ ہم اپنی خوشیوں کے بدلے دوسروں کی خوشیوں کو غارت نہ کر دیں۔ اگر ہم چاہیں تو زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، یہ ہمارا حق ہے لیکن ہمارا فرض یہ بھی ہے کہ ہم اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں دوسروں کی تمناؤں کا خون نہ کرتے رہیں، شومئی قسمت سے ہمارا معاشرتی مزاج کچھ ایسا ہی بن گیا ہے۔ ہر خوشی کی محفل اب عیش و طرب کی محفل بن گئی ہے اور اس میں نہ خوف خدا رہتا ہے نہ خوفِ قانون۔

شادیوں میں ڈھول ڈھمکا، شور و غوغا اور دھینگا مشتی تو روایت بن ہی گئے ہیں اب تیر و تفنگ بھی اس کا حصہ بنتے جا رہے ہیں، جب تک شادی میں کلاشنکوف کے جوہر نہ دکھائے جائیں اور گولیوں کی بارش نہ کی جائے تو خوشی مکمل نہیں ہوتی لیکن اس کے کیا نتائج ہوتے ہیں اس پر پل بھر سوچنے سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، مجھے چند سال پہلے ایک دوست نے بتایا تھا کہ وہ چھت پر سو رہا تھا کہ اسے کہیں سے ایک گولی آن لگی، وہ یہ چھان بین کرنا تو بھول گیا کہ یہ کہاں سے آئی تھی اسے تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور خدا خدا کر کے وہ رو بصحت ہوا۔ ابھی چند روز قبل ایک اور واقعہ ہمارے قریبی عزیزوں میں خون کے آنسو رُلا رہا ہے، میری اہلیہ کی ایک کزن

سنت نگر لاہور میں مقیم ہے اس کی پانچ سالہ بچی شام کے وقت صحن میں کھیل رہی تھی کہ اسے اس کی دل دوز چیخ سنائی دی وہ دوڑ کر باہر آئی دیکھا کہ سر سے خون کا فوارہ جاری ہے انہیں سب سے پہلا خیال آیا کہ وہ کسی ہسپتال کی راہ لیں، ڈاکٹرز نے بتایا کہ بچی کو گولی لگی ہے شکر ہے وہ ہلاک نہیں ہوئی۔ لیکن گولی نکالنا بھی محال ہے کئی روز گزر چکے ہیں، بچی زیرِ علاج ہے کبھی ماں چیختی ہے تو کبھی باپ چلاتا ہے، ادھر علاج پر وہ خرچ اٹھ رہا ہے کہ ان کی بساط سے باہر ہے لیکن وہ اس کی جان بچانے کے لئے سب کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں۔

سوچئے! ذرا سوچئے، کسی کے چند لمحوں کی خوشی نے کیا قیامت ڈھائی اور ایسی کتنی قیامتیں روز ٹوٹتی ہیں، ایسے کتنے المیے وقوع پذیر ہوتے ہیں، کتنی خون آشام خوشیاں منائی جاتی ہیں، کتنی مسرتیں اور شادمانیاں کتنے گھر اجاڑتی ہیں اس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں، شادیوں اور مختلف تقریبات میں اسلحہ کی نمائش اور ظالمانہ اور بہیمانہ ہوائی گولیوں کے استعمال کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا کوئی قانون اس کی اجازت نہیں دے سکتا، وطنِ عزیز میں اس کی ممانعت ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے عوام الناس قانون آشنا نہیں، قانون کی دھجیاں اڑانا اور عیش کی دیوی پر ایک دوسرے کی جانیں قربان کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے، ممکن ہے جو اس طرح کے حادثات کا شکار ہوتے ہوں وہ بھی اس لہو ولعب کے مرتکب ہوتے ہوں لیکن جب گولی اپنے سینے میں لگتی ہے تب چیخ نکلتی ہے اور گولی سینہ آشنا نہیں ہوتی اور وہ یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے سینے کو چھلنی چھلنی کر رہی ہے، آج آپ نے عیش ونشاط سے مغلوب ہو کر کسی کے لئے مصیبتوں کے پہاڑ توڑے ہیں تو کل یہ پہاڑ آپ پر بھی ٹوٹ سکتے ہیں، کیوں ہم یہ نہیں سوچتے کہ برا کام بُرا ہوتا ہے اور عیش و طرب کے یہ بہیمانہ مناظر ہولناک ہوتے ہیں، جو دولت کا ضیاع ہوتا ہے اس کا تو ذکر ہی کیا! زندگی کی دولت لٹ جاتی ہے، کتنے بے گناہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بسنت کی رُت، بہار کے دن، خوشیوں سے جھولیاں بھر دیتے ہیں لیکن ان خوشیوں کو کس طرح غارت کر دیا جاتا ہے اس کا مشاہدہ ہم ہر سال کرتے ہیں، کچھ قانون نافذ کرنے والی

قوتیں اس صورتحال کا جائزہ لیتی ہیں اور اس طوفان بدتمیزی اور سیلِ بہیمیت کو روکنے کی کوشش کرتی ہیں تو کچھ اور قوتیں اس کے حق میں دلائل دیتی نہیں تھکتیں حالانکہ ان کے سامنے کتنے خوفناک واقعات رونما ہوتے ہیں، گردنیں کٹ جاتی ہیں، ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں، چھتوں سے گر کر جان کی بازی ہار دیتے ہیں، بے ہنگم موسیقی کتنی پرسکون نیندوں کا خون کرتی ہے، کتنے مریضوں کی زندگی سے کھیلتی ہے کتنی خفتوں کو جنم دیتی ہے، چھتیں فحاشی کا اڈا بن جاتی ہیں اور بازار شیطانی اکھاڑا۔ لیکن پھر بھی بعض زعما، بعض اصحابِ خرد ودانش خوشی کے نام پر اس خونی ڈرامے کا جواز پیش کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ مانا کہ آپ کو اپنی جان کی پرواہ نہیں، آپ خودکشی کرنے پر تیار ہیں، خودکشی کیجئے، جہنم رسید ہو جایئے مگر کسی کی جان سے تو نہ کھیلئے، کسی کا سہاگ تو نہ لوٹیے، کسی جواں سال زندگی کو غارت تو نہ کیجئے، شہر کا امن وسکون درہم برہم تو نہ کیجئے۔ یقیناً ایسی قوتیں ہیں جنہیں اس سارے خونی ڈرامے سے ڈھیروں دولت ملتی ہے، ان کے کاروبار چمکتے ہیں، روپے کی ریل پیل ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ تو سمگلنگ ڈاکہ زنی، منشیات فروشی اور عصمت فروشی سے بھی حاصل ہوتا ہے تو کیا پھر آپ اس کا جواز بھی فراہم کرنا شروع کر دیں گے اور اگر کریں گے تو کیا اس جواز کو کوئی قبول کرے گا!!

اربابِ اختیار کا فرض ہے کہ وہ بے اختیار نہ ہو جائیں، اس خونی ڈرامے میں اگر وہ تساہل سے کام لیتے ہیں یا کوئی مصلحت آڑے آتی ہے تو وہ بھی اسی ڈرامے کا کردار تصور کئے جائیں گے، بڑی دل سوزی اور دردمندی سے یہ معروضات پیش کی جا رہی ہیں کہ شاید یہ بات کسی کے دل میں اتر جائے اور بے گناہ اور بے خطا زندگیاں لقمۂ اجل بننے سے بچائی جا سکیں۔

☆☆☆☆

ہو محفلِ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

علامہ اقبالؒ نے تو اپنے شعر میں مردِ مومن کی صفت ''بریشم کی طرح نرم'' ہونا بتائی ہے اور علامہ اقبالؒ ہی نے اپنے کلام و خطبات اور خطوط میں یہ بات بھی بتا دی ہے کہ مردِ مومن ہوتا کون ہے، اقبالؒ کی تحریروں سے جانے کس کس نے کیا کیا سمجھا ہے۔ کچھ ہماری سمجھ میں بھی آیا ہے اور مردِ مومن کے حوالے سے جو ہماری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ مردِ مومن دستِ قدرت ہونے کے ساتھ ساتھ دلوں کو فتح کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، اس کے لفظوں میں وہ شیرینی، حلاوت اور لطافت ہوتی ہے کہ ہر شخص اس کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مردِ مومن شاید کولرج کا Ancient Mariner بھی ہے، جس کی آنکھوں میں اتنی قوت ہے اور زبان میں اتنا طلسم کہ شادی میں شریک ہونے کے لئے جانے والا شخص اس کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے، وہ دور سے دلہا کو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے، لوگوں کی آمد و رفت کا مشاہدہ بھی کر رہا ہوتا ہے، گھنٹیوں کی آواز بھی سن رہا ہوتا ہے مگر وہ Ancient Mariner کی کہانی سنے بغیر نہیں رہ سکتا اور سنتا چلا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں مردِ مومن کی یہ صفت سب سے زیادہ قابلِ تحسین ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی اقلیم دل کی ہوتی ہے اور جو اس اقلیم کو فتح کرے وہی سکندرِ اعظم ٹھہرے گا، وہی رستمِ زماں کہلائے گا۔ لفظ جادو ہی تو ہوتے ہیں، جب وہ کسی صاحبِ دل اور صاحبِ احساس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کیا کہنے! صحرا میں پھول کھلنے لگتے ہیں، موسمِ گرما میں رم جھم رم جھم ہونے لگتی ہے، پھولوں کے رنگ شوخ ہونے لگتے ہیں، جن پر بہار آ جاتی ہے، عشق رقص کرنے لگتا ہے، جھومنے لگتا ہے، یہ مردِ مومن، یہ مردِ حُر، یہ خوش کلام، یہ سحر البیان محبوبِ قلب و نظر بن جاتا ہے اور اس کے لفظوں کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے، سامعین اور قارئین پر ایک وجد اور سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے خوش کلام ہمارے رسولِ مقبول بھی تھے ان کے صحابہ کرامؓ بھی تھے اور بہت سے بزرگانِ دین بھی تھے، ایسے لوگ اب بھی ہیں مگر کم بہت ہی کم، لیکن جب یہ ملتے ہیں تو

کمال کر گزرتے ہیں، یہ باتوں کا جادو نہیں جگاتے، لفظوں سے نہیں کھیلتے، جذبوں کا استحصال نہیں کرتے بلکہ زندگی کے زخم مندمل کرتے ہیں، آنسو پونچھتے ہیں، دل بہلاتے ہیں، مردہ روحوں کو زندگی عطا کرتے ہیں، افسردگی کافور ہو جاتی ہے اور زندگی موجزن۔ یہ سحر اساتذہ میں بھی ہوتا ہے اور رہنماؤں میں بھی۔ قائدِ اعظم کی باتوں میں وہ جادو تھا کہ سننے والے نہ سمجھنے کے باوجود بھی اس قدر سمجھ جاتے تھے کہ ان کے ہر لفظ پر ان کی زبان سے قائدِ اعظم زندہ باد کا نعرہ بلند ہوتا تھا، قائد میں کیا طلسم تھا کہ انگریزی زبان ان پر بھی اثر کرتی تھی جو اس سے واقف ہی نہ تھے، یہ طلسم قائد کا خلوص تھا، ان کی مستقل مزاجی تھی، ان کی دیانت داری تھی اور راست گوئی۔ خلوص لفظوں کی روح رواں ہوتا ہے، محبت جملوں کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے اور پھر لفظ لفظ نہیں رہتے الہام بن جاتے ہیں، وحی کی شکل اختیار کر جاتے ہیں، ان پر اعتبار کئے ہی بنتی ہے ہمارے ہاں شعلہ بیاں مقررین کی کمی نہیں جن کی فلک شگاف آواز دلوں کو دہلا دیتی ہے مگر دلوں کو جیت نہیں سکتی کیونکہ اس فصاحت اور بلاغت کے پیچھے خلوص کی کمی ہوتی ہے، ایسے لوگ لفظوں سے بمباری کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں، ان کے الفاظ کہیں فضاؤں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور جوش چند لمحوں تک باقی رہتا ہے لیکن ایک مخلص انسان اللہ کا پیارا، انسانوں سے محبت کرنے والا اپنی سادہ زبان سے بھی لوگوں کے دل موہ لیتا ہے۔ ہم ایسے اشخاص کو بھی جانتے ہیں جو نہایت سادہ لباس پہنے ہوتے ہیں ان کے پاس القاب ہوتے ہیں نہ اعزازات اور نہ ڈگریاں لیکن ہر کوئی انہیں سنتا ہے اور سر دُھنتا ہے، مجھے خود اپنے بعض اساتذہ یاد ہیں جن کی باتیں ہمیں زندگی سے بھرپور نظر آتی تھیں اور ہمیں زندگی عطا کرتی تھیں، مجھے معصوم بچوں کی آوازیں بھی خلوص و محبت کا پیکر نظر آتی ہیں بلکہ ہوتی ہیں ان کے پیارے پیارے الفاظ اور میٹھے میٹھے جملے سرمایۂ حیات ہوتے ہیں اور زندگی کی تمام تلخیاں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں، دفتروں کی میکانکی زندگی سے جب کوئی فرد گھر لوٹتا ہے اور بچوں کی پیاری پیاری باتیں سنتا ہے تو اس کی روح رقص کرنے لگتی ہے اور وہ تازہ دم ہو جاتا ہے، یعنی کسی محبوب دل و نظر کی آواز کانوں میں رس گھولتی ہے، بلبل کا نغمہ بن جاتی ہے اور پپیہے کا گیت نظر آتی ہے،

جب کوئی محبوب محبت بھرے الفاظ ادا کرتا ہے پیار کے دو بول بولتا ہے تو ہمیں بے دام خرید لیتا ہے، ہم اس کے ہو جاتے ہیں، ہم اس پہ مرمٹتے ہیں اور اس کا ایک ایک لفظ ہمیں عمر بھر یاد رہتا ہے۔ ہماری رائے میں یاروں کی بزم ہی بزمِ حیات ہے، جہاں کچھ اپنے بیٹھے ہوں وہاں جی چاہتا ہے کہ دل کی کہیئے، دل کی سنئے، گھنٹوں میں گزر جاتے ہیں، صبح کو شام ہونے میں دیر نہیں لگتی اس لئے اقبالؒ نے سچ ہی تو کہا تھا کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ہم کہیں گے کہ حلقۂ یاراں کی ہر صبح زندگی کی صبح ہوتی ہے اور ہر شام سبدِ حیات، جس میں محبت اور چاہت کے پھول ہی پھول ہوتے ہیں۔

احبابِ گرامی! آپ کا کیا جاتا ہے، اگر آپ پیار کے دو بول بول دیں، جو آپ کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں، جن میں مکاری اور تصنع نہ ہو، مانا کہ مادی دنیا نے ہمیں صرف مادہ بنا دیا ہے ہم بھول گئے ہیں کہ انسان روح بھی ہے، بلکہ روح ہی تو ہے۔ ہماری زندگی کی ذاتی مصلحتوں نے ہم سے سب کچھ چھین لیا ہے، ہم دنیا بھر کی دولت سمیٹ کر بھی مفلس اور تنگ دست ہیں کیونکہ اصل دولت پیار کی دولت ہوتی ہے اور دل سے نکلے ہوئے الفاظ اور جذبوں کی دولت ہوتی ہے، کاش کہ یہ بات ہمیں سمجھ آنے لگے اور جس قدر جلد سمجھ آئے گی اتنا ہی ہمارے لئے فوز و فلاح کا باعث بنے گی اور ہماری زندگی کو معنی خیز بنائے گی۔

☆☆☆☆

شاخِ گلاب

جس شاخِ گلاب پر میں یہاں گفتگو کرنے چلا ہوں یہ وہ شاخِ گلاب نہیں جو آپ کو کہیں کہیں نظر آجاتی ہے بلکہ یہ وہ شاخِ گلاب ہے جسے آپ محسوس کر سکتے ہیں، دیکھ نہیں سکتے۔ یہ شاخِ گلاب روح سے واسطہ ہے، جذبوں میں پیوست ہے اور احساس سے متعلق ہے، میری مراد اس کیفیت سے ہے جو آپ کو گلاب کی طرح دلکش، جاذبِ نظر اور ہر دلعزیز بناتی ہے، آپ ہر دل عزیز ہی نہیں بنتے بلکہ خود اپنے آپ کو بھی پیار کرنے لگتے ہیں، آپ کسی نرگسیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ آپ کو سچ مچ یوں لگنے لگتا ہے کہ آپ کی کلفتیں، آپ کے مسائل اور الجھنیں کچھ بھی تو نہیں۔ اس کیفیت کو آپ چاہیں تو اطمینانِ قلب کا نام دے لیں، مسرت کہہ لیں یا خوشی سے موسوم کر لیں، جس کی تلاش میں جانے کتنی روحیں سرگرداں رہیں، کتنوں نے تاج و تخت چھوڑ دیئے اور جنگل کی راہ لی، کتنے تھے جنہوں نے زندگی ہی تج دی، کتنے اپنی ذات کے خول میں اسیر ہو کر رہ گئے اور کتنے "سب ٹھیک ہے" کی مالا جپنے لگے، کچھ سیم و زر کی کانوں میں اسے تلاش کرنے لگے تو کچھ جاہ و منصب کی مسند پر، لیکن یہ رُوحانی کیفیت کہیں اندر سے غیر محسوس انداز سے پیدا ہوتی ہے اس کے لئے ایک خاص آب و ہوا ایک خاص ماحول ایک خاص ذہنی تربیت اور زاویۂ فکر کی ضرورت ہے، ہم سب خوش رہنا چاہتے ہیں اور خوشی کے لئے جان اور ایمان تک بیچ دیتے ہیں لیکن پھر بھی خوشی ہمیں حاصل نہیں ہوتی تو پھر خوشی، مسرت اور اطمینان کے حصول کے کیا ذرائع ہیں، میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا شاید کوئی بھی نہیں کہہ سکتا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ خوشی کا تعلق آپ کے اپنے رویے اور طرزِ زندگی سے ہے اگر آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو خوش رہنے کا ارادہ کر لیجئے۔ یہ ارادہ بہت مشکل ہے، یہ عزم بہت دشوار ہے، کوئی سوگند، کوئی حلف اس کے لئے کافی نہیں، پورے جسم اور پوری روح کو تیار کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر اطمینانِ قلبی اور سکونِ ذہنی نصیب ہو سکتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ خوشی اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے، دلوں کا اطمینان

اسی کی ذات میں مضمر ہے مگر اس کے ذکر اور اس کی ذات سے مراد کیا ہے؟ کیا محض "اللہ اللہ" کے ورد سے اللہ کو خوش کیا جا سکتا ہے؟ شاید نہیں اللہ اللہ کا ورد آپ کے روئیں روئیں میں سرایت کرنا چاہیے، آپ کے ہر عمل سے ظاہر ہونا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ منہ میں رام رام ہو اور بغل میں چھری اور پھر آپ کو اطمینانِ قلبی حاصل ہو جائے، آپ کے ہاتھ میں ہزار منکے کی تسبیح ہو اور آپ نے ہزاروں دلوں پر قیامتیں ڈھائی ہوں اور ہزاروں کے حقوق سلب کئے ہوں اور پھر آپ کو قربِ الٰہی حاصل ہو جائے، ایسا ممکن ہی نہیں۔ اللہ کا ذکر اور اس کی یاد یہ ہے کہ آپ اس کے رنگ میں رنگے جائیں اور اس کا رنگ سب سے اچھا رنگ ہے، اس کے رنگ میں رحم، کرم، عدل، عفو، درگزر، محبت، اخوت اور اسی طرح کی صفات موجود ہیں۔ دراصل اطمینانِ قلبی کے حصول کے غلط ذرائع بیان کئے گئے ہیں۔ اصل ذریعہ اور اصل منبعِ ہدایت حضرت نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات ہے جنہوں نے اپنے عمل، اپنے قول، اپنے ہر قدم اور ہر خیال سے ثابت کیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ کتنا دلآویز ہے وہ رنگ، کتنی دلکش ہے اس کی آب و تاب، کتنا رُوح پرور ہے اس کا نظارہ، کتنی جاں آفریں ہے اس کی لذت۔ کبھی اس رنگ میں خود کو رنگ کر تو دیکھئے، کائنات آپ کے قدم چومنے لگے گی، زندگی آپ کے اشارے پر رقص کرنے لگے گی اور آسانیاں ہی آسانیاں نصیب ہوں گی۔ جب آپ دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کریں گے تو آپ کو راحت نصیب ہوگی اور سکون ملے گا، یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے اپنے گھر کی گندگی اپنے محلے میں پھینک دیں اور پھر یہ محسوس کر بیٹھیں کہ آپ تمام بیماریوں سے محفوظ ہیں۔ وہ گند جو آپ کے محلے میں پڑا ہے، وہ عفونت جو آپ کی گلی میں بکھری ہے اس کے تمام جراثیم کا لاؤ لشکر آپ پر ٹوٹ پڑے گا، آپ کو روند کر رکھ دے گا، آپ کی صحت کے سارے خواب پاش پاش ہو جائیں گے اور آپ کو اس کا احساس تک نہیں ہوگا کہ قیامت کیونکر برپا ہوئی، اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت دولت ہے، بہت سرمایہ ہے، آپ جو چاہیں خرید سکتے ہیں، جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں، حُسن آپ کی جھولی میں ہے، عشق

آپ کا ہم سفر ہے تو آپ غلط سمجھتے ہیں۔ جب صرف آپ کے پاس تمام نعمتیں ہوں اور آپ کی گلی آپ کا محلّہ، آپ کا شہر نانِ شبینہ کو ترس رہا ہو، کسی کے سر پر چھت تک بھی نہ ہو اور کوئی چیتھڑوں میں ملبوس ہو تو آپ کیسے اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی ہاتھ آپ کی طرف بڑھ سکتا ہے، کوئی بے بسی کی تلوار آپ پر حملہ آور ہو سکتی ہے، کوئی مجبوری کا خنجر آپ کے جگر پر چل سکتا ہے۔ آپ کی دولت صرف آپ کی نہیں اس پر آپ کے پورے ماحول اور گرد و پیش کا حق ہے اگر آپ سب کے ساتھ مل کر کھاتے پیتے ہیں، سب کو سکون دیتے ہیں تو سب آپ کے شیدا و بالا ہو جائیں گے پھر آپ امیر المومنین ہو کر بھی درخت کے نیچے بوریے پر بلا خوف لیٹ سکتے ہیں، کسی کی تلوار آپ پر نہیں اٹھے گی، کسی کا ہاتھ آپ کے گریبان کی جانب نہیں بڑھے گا، کوئی راہزن لُوٹ کر نہیں لے جائے گا۔ اگر آپ سب کچھ بانٹ کر کھاتے ہیں سب کے دکھوں اور خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں تو آپ کی دسترس میں جس کا ذکر کیا گیا ہے اور جس کا منبع و مصدر آپ کا حُسنِ عمل ہے وہ شاخِ گلاب ہوتی ہے، جس کا انحصار آپ کی سوچ پر ہے "جیو اور جینے دو" کا نعرہ محض ایک نعرہ بن کر رہ گیا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو اس کے مفہوم سے واقف ہیں "جیو اور جینے دو" کا مطلب ہے کہ آپ خود بھی شادکام رہئے اور دوسروں کو بھی شادکام رہنے دیجئے خود بھی کھایئے اور دوسروں کو بھی کھانے دیجئے ایسا نہ ہو کہ آپ کے گودام گندم سے بھرے ہوئے ہوں اور کوئی دانے دانے کو ترس رہا ہو، آپ کے کارخانے، آپ کی ملّیں، آپ کو امیر سے امیر تر بنا رہی ہوں اور آپ کے مزدور نانِ جویں کو ترس رہے ہوں، آپ کی بیماری کے علاج کے لئے ہسپتال ہی ہسپتال موجود ہوں اور کوئی بیار بستر پر تڑپ رہا ہو اور اس کا کوئی پرسانِ حال تک نہ ہو، یہ بے انصافی، یہ ظلم و زیادتی اس اللہ کو پسند نہیں جس کو آپ تسبیح کے دانوں میں تلاش کرتے ہیں، وہ تو موجود ہے ان کی آہوں میں جنہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے، ان کے دُکھوں میں جس کا آپ کو احساس نہیں ہے

حضرات گرامی! خوشی اللہ کا ایک انعام ہے اس کا تعلق لعل و جواہر سے نہیں تخت و تاج اس سے لاتعلق ہیں اس کا تعلق تو آپ کی قناعت سے ہے، آپ کے صبر اور استحکام سے ہے مگر اس

قناعت اور صبر کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہوں، آپ اس زُعم میں گرفتار ہوں کہ آپ پر من وسلویٰ نازل ہو جائے گا، چھت پھاڑ کر نیلی چادر والا آپ کی جھولیاں بھر جائے گا، آپ کی قسمت آپ کے ہاتھ میں اشرفیاں تھما جائے گی، خوشیاں دے جائے گی، ایسا ممکن نہیں۔ نظامِ الٰہی یہ ہے کہ کوشش کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں، کوشش اور مسلسل کوشش ہی زندگی کا سنہری اصول ہے، سنہری ضابطہ حیات ہے۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے اپنی ساری زندگیاں تنگ و نازحیات میں گزار دیں، دن رات محنت وکوشش کی اور انہیں یقین رہا کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو رائگاں نہیں جانے دیں گے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتے، محنت ضروری ہے، ازبس ضروری ہے۔ قسمت کے لات ومنات جو ہم نے تراش لئے ہیں یہ ہماری سستی اور بے عملی کے شاخسانے ہیں، ہماری کہل انگاری کی سازشیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے عمل میں آزاد ہے بالکل آزاد تبھی تو حشر کے دن اس کا حساب ہوگا اس سے پوچھا جائے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا کیوں نہیں کھلایا، میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی کیوں نہیں پلایا، میں حاجت مند تھا تو نے میری حاجت روائی کیوں نہیں کی، اگر قسمت پہلے ہی تحریر ہو چکی ہے جیسا کہ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے تو پھر یومِ حساب کے کیا معنی ہیں، خدا عدل اور انصاف کا منبع ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے ہمیں بے بس بنا دیا ہو اور پھر ہم سے ہمارے اعمال پر باز پرس کرے نہیں ایسا ہرگز نہیں، ہم سب آزاد ہیں، اپنے عمل میں اور اپنے فکر میں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے فکر اور اپنی سوچ کو مثبت راہوں پر چلائیں، ہمارا فکر تخلیقی ہو اور جذبہ ہمہ گیر، ہم محبت سے سرشار ہوں، انسانوں سے محبت کریں بلکہ جانوروں سے بھی......... ہر ذی حیات سے محبت، کہ سب کا رب وہی رب ہے جو ہمارا رب ہے اور اگر ہمیں اس کی مخلوق سے پیار ہے تو ہم اس سے پیار کا دعویٰ کر سکتے ہیں وگرنہ سب عیاری فریب اور مکاری ہے جو ان استحصالی قوتوں کو اور بھی طاقت ور بنا دیتی ہے، امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر۔ بدقسمتی سے یہ صورتحال ایک مخصوص طبقے کے حق میں ہے اس لئے وہ اس صورتحال کو تبدیل کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دینا

چاہتا ہے تا کہ اس کی عمل داری قائم رہے، اس کا استحصال جاری رہے اور تمام دنیا پر اس کا تسلط قائم رہے، ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اس شاخِ گلاب کی دریافت کر سکیں، اس اطمینان کو ڈھونڈ سکیں اور تلاش کر سکیں جو سب کے لئے ہے، جو سب کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتی ہے، جو محمود و ایاز میں کوئی فرق نہیں کرتی، جس میں نہ کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا، نہ کوئی عربی ہے نہ عجمی، نہ کوئی کالا ہے نہ گورا، سب ایک ہیں اور ایک ہی رب کی مخلوق۔

☆☆☆☆

یا اللہ!

قدرت اللہ شہاب نے ہجرت کی قیامت صغریٰ کو اپنے ناولیٹ "یا خدا" میں جس دل سوزی سے بیان کیا ہے اس کے گواہ میرے وہ حواس بھی ہیں جنہوں نے ابھی آنکھ نہیں کھولی تھی۔ تاہم ان حالات کی تباہ کاریاں میرے لاشعور کا حصہ ضرور بن گئیں تھیں اور میں کوئی شور، کوئی ہنگامہ سن کر اس کی وجہ جانے بغیر ہی چیخ اٹھتا تھا کیونکہ میرے اپنے والدین نے اس قیامتِ صغریٰ کا اپنے تمام تر ہوش و حواس کے ساتھ مشاہدہ کیا تھا۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ ہجرت سے پہلے کوئی دن بھی قیامت سے کم نہ ہوتا تھا اور یہ خوف لگا رہتا تھا کہ ادھر سے حملہ ہوا، اُدھر سے قیامت ٹوٹی۔ ایک شام تو محلے میں وہ ہنگامہ ہوا کہ میرے والدین نے اپنے مکان سے دوسرے مکان میں چھلانگ لگادی اور مجھے بھی پھینک دیا، زہے نصیب کہ مجھے ایک ہندو پڑوسی نے ٹھیک ٹھیک تھام لیا اور بقول ان کے کرنال سے لاہور تک کا سفر کسی طرح بھی قیامت سے کم نہ تھا۔ ہر طرف قتل و غارت تھی اور میری بڑی بہن جو مجھ سے چار پانچ سال بڑی تھی کو کہا گیا تھا کہ وہ انہیں "چچا جی" اور "ماتا جی" کہے کہ کہیں بوکھلائے ہوئے سکھ ان کا کام تمام نہ کردیں، لیکن اس سے بڑی قیامت کا ذکر لاہور کے جناح کیمپوں میں قدرت اللہ شہاب نے اپنے ناولیٹ "یا خدا" میں کیا ہے کہ کس طرح اسی لمحے جب ابھی آزادی کا سورج طلوع ہو رہا تھا یارانِ تیز گام اپنی عیاریوں اور مکاریوں سے اپنا گھر بھرنے میں منہمک ہوگئے اور پل بھر میں سب کچھ بھول گئے تھے، یہ ایک بہت بڑی قیامت تھی جو مسلمانوں پر گزری تھی۔

لیکن آج کی قیامت کو کیا کہیے گا جس سے ہم سب دوچار ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہمارا وجود ہی پارہ پارہ ہوا چاہتا ہے، ہمارے احساس کی طنابیں ٹوٹنے کو ہیں، جس طرف دیکھئے ایک سراسیمگی ہے، ایک ناامیدی ہے، سوات کے آفت زدگان کی جو صورت حال ہوئی وہ تو ہے ہی وہ

لوگ جو تا حال محفوظ ہیں خوف کے مارے نفسیاتی مریض ہوا چاہتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمیں حقائق کو ان کے اصل پس منظر میں دیکھنے کی ہمت ہونی چاہیے اس میں کلام نہیں کہ من حیث القوم ہم سے غلطیاں ہوئیں بلکہ ناقابلِ معافی غلطیاں ہوئیں ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اب صورتِ حال کو کیسے سنبھالا جا سکتا ہے، کیسے ہم اپنی قوم کو ایک بار پھر زندگی عطا کر سکتے ہیں، کیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا سکتے ہیں اور اپنے خوابوں کو کیسے تعبیر عطا کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام تر ابتلاؤ آزمائش کے باوجود ہمیں بطور قوم اس کا تا حال احساس نہیں ہو پایا، ابھی تو ہم ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں اپنے اضطراب کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ وقت بہت جلد آجانا چاہیے جب ہمیں یہ احساس ہونے لگے کہ جس قیامت سے ہم دوچار ہیں اس قیامت کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم تقدیر کو بُرا بھلا کہہ کر اپنی خفگی کا اظہار کر لیتے تھے اور کبھی کبھی مطمئن بھی ہو جاتے تھے کہ جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہو اسے کیسے مٹایا جا سکتا ہے، اگر کسی کو نانِ شبینہ دستیاب نہیں تو وہ شکر ادا کرے اور سکون سے سو جائے کہ اس کی قسمت میں یہی لکھا ہے اور قناعت اور تقویٰ کا یہی تقاضا ہے۔ لیکن پھر ذرا علم کی روشنی پھیلی، ابلاغ عامہ کے کارپردازوں نے حقائق منکشف کرنا شروع کیے تو ہم اپنی حکومتوں کو، اپنے حاکموں اور اربابِ حل و عقد کو بُرا بھلا کہنے لگے اور ابھی تک کہہ رہے ہیں، کبھی ہم فوجی آمریت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں تو کبھی جمہوریت کی نیلم پری کو، کبھی ہم سرمایہ داری نظام پر اپنا غیض و غضب صرف کر دیتے ہیں تو کبھی صوبائی اور علاقائی تعصب پر، لیکن ہر تجزیے میں ہم اپنی ذات کے تجزیے کو کبھی محلِ نظر نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ جیسی رعایا ہوتی ہے ویسے ہی ان کے حاکم ہوتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ حاکم اپنی رعایا کی نفسیات کو اچھی طرح پہچان لیتے ہیں اور پھر اس کا خوب خوب استحصال کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہم اپنے دائرۂ اختیار میں کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں، ہم اپنے

گھر میں انتظام وانصرام کیسے چلاتے ہیں، اپنے دفتر میں کیا کارکردگی سرانجام دیتے ہیں، اپنی مصنوعات میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، لین دین کیسے کرتے ہیں اور انصاف کے تقاضوں پر کس طرح پورے اترتے ہیں۔ اگر ہم اپنے گریبان میں جھانکنا شروع کر دیں تو ہمیں موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی۔ مملکتِ خداداد پاکستان حاصل تو ہمیں ہو گئی لیکن پھر ہم میں سے ہر ایک نے اپنے فرائض سے کس طرح غفلت کی اور دوسروں کے حقوق کو کس طرح پامال کیا یہ ایک ایسی داستان ہے جسے ہم نہ پڑھنا چاہتے ہیں نہ سننا چاہتے ہیں۔ ہر شخص اپنے عہدے پر صدرِ پاکستان اور وزیرِ اعظم پاکستان ہوتا ہے، بڑی حد تک وہ اپنے عمل کا ذمہ دار ہو سکتا ہے لیکن رات بھر میں امیر ہو جانے کی خواہش اور زندگی کی تمام نعمتیں اکٹھا کر لینے کی تمنا نے ہم سے ہماری آنکھیں چھین لی ہیں، سماعتوں سے محروم کر دیا ہے، زبان بند کر دی ہے اور اگر کبھی آنکھ کھلی بھی تو دوسروں کی آنکھ میں تنکا ہی نظر آیا اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں۔ اگر کانوں میں سننے کی استطاعت پیدا ہوئی تو اپنی مرضی کی بات سننا چاہی، اگر زبان گویا ہوئی تو اس نے اپنے ذاتی اغراض کے راگ ہی الاپے، جب یہ صورتِ حال ہو تو پھر موجودہ صورتِ حال کا ہمیں کسی اور کو موردِ الزام ٹھہرانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے، جب ہم من حیث القوم یا من حیث الفرد اپنے آپ ہی سے مخلص نہیں تو ہم کسی اور سے خلوص و محبت کا تقاضا کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ خود احتسابی کا احساس پیدا ہونے میں ابھی وقت لگے گا اور خوف یہ ہے کہ اس سے پہلے صورتِ حال اتنی زیادہ نہ بگڑ جائے کہ پھر ہم بیٹھے بیٹھے خود احتسابی کرتے رہیں، اپنے آپ کو لعن طعن کرتے رہیں، قصوروار ٹھہراتے رہیں اور اس کا کوئی بھی فائدہ برآمد نہ ہو کہ "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔ جب کھیت ہی اپنا نہ رہے تو پھر فصلِ خزاں ہو یا فصلِ بہار کچھ فرق نہیں پڑتا، جب ہم غلام بن جاتے ہیں تو پھر تو کچھ بھی ہمارا نہیں رہتا جو ہمارا ہوتا ہے اس پر بھی ہمارا تصرف نہیں ہوتا۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہم موجودہ حالات میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں، یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سب نعمتیں جو ہمارے ملک نے ہمیں دی ہیں ان کی حفاظت کرنا ہمارا

فرض ہے اور اگر ہم ان نعمتوں سے ہی محروم ہو جائیں تو پھر ہمارے سارے خواب بکھر سکتے ہیں، ساری کوششیں اکارت جا سکتی ہیں، اگر ہم نظامِ مصطفیٰ چاہتے ہیں تو اس کا نفاذ کہاں ہوگا اگر ہم زیورِ علم سے آراستہ ہونا چاہتے ہیں تو ایسا کون کرنے دے گا۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہماری کیا حالت تھی اور اب کیا حالت ہے، ہم میں سے کتنے ہیں جنہیں زندگی کی بے پناہ آسائشیں حاصل ہیں اور وہ بھی جس کے ذرائع محدود ہیں، پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسودہ ہے، کبھی ایک بائیسکل کا خریدنا بھی ایک بہت بڑی خوشی کا باعث سمجھا جاتا تھا اور اب ہم میں کتنے ہیں جو بائیسکل استعمال کرتے تھے اور اب کاروں میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، ایک کمرے کے مکان میں رہتے تھے اور جانے کتنوں نے محلات تعمیر کر لئے ہیں۔ گاؤں میں اگر کوئی میٹرک کر لیتا تھا تو ایک بڑی خبر ہوتی تھی اور اب گاؤں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کوئی کمی نہیں، کارخانے اور فیکٹریاں ہیں، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، کشادہ سڑکیں، بڑے بڑے ہوٹل اور عالیشان پلازے، ہر ہاتھ میں موبائل، آرام دہ گاڑیاں اور جانے کیا کیا کچھ، یہ سب کچھ پچاس ساٹھ سال پہلے ہمارے پاس تھا، یہ سب وطنِ عزیز کی دین ہے جس کو اب ہم پارہ پارہ کرنے پر تلے ہیں، جس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں، جس کے حال و مستقبل سے کھیل رہے ہیں لیکن ہم یہ بھولتے جا رہے ہیں کہ اگر اس پاک سرزمین کو کوئی نقصان پہنچا تو ہماری آئندہ نسلوں کا کیا حال ہوگا، ان کا مستقبل کس قدر تاریک ہوگا اس کے تصور ہی سے ہمارا رواں رواں کانپ اٹھنا چاہیے، ہماری راتوں کی نیند اڑ جانی چاہیے لیکن ہم ہیں کہ آپس میں دست و گریباں ہیں، کہیں صوبائی عصبیت ہے تو کہیں لسانی اختلاف، کہیں فروعات پر واویلا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب باہمی اختلافات کو بھول جائیں، نیک اور بد دونوں گلے ملیں، اچھے اور بُرے شیر و شکر ہو جائیں، ایک بن جائیں۔

اگر وہ زمین جس پر ہم چل رہے ہیں وہ ہی نہ رہی تو کیا باقی رہ جائے گا۔ ہمیں وہ دن نہیں بھولنا چاہیے جب ہم اپنی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار تھے۔ ہمیں یاد

رکھنا چاہیے کہ ہمارا کس طرح استحصال ہو رہا تھا ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ہم دوسرے اور تیسرے درجے کے شہری تصور ہوتے تھے، ہمیں اپنے دشمنوں کو پہچاننا چاہیے بلکہ یقین کر لینا چاہیے کہ انہیں پہچانتے ہیں، ہمارے آباؤ اجداد، ہمارے دشمنوں کی ہمیں پوری طرح شناخت کرا چکے ہیں، ہم انہیں پوری طرح جان چکے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عدل و انصاف اور محبت کو دستورِ حیات بنائیں اور پھر وہ جذبہ پیدا کریں جو تحریکِ پاکستان کے دوران ہمارے دلوں کی دھڑکن، ہماری روح کی پکار اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔

☆☆☆☆

دریائے ہمت کا شناور

بال و پر نوچ کے میداں میں اُتر
ورنہ پرواز میں لذت کیسی

کبک پا از شوخیِ رفتار یافت
بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

ان دونوں اشعار میں ہمت، تگ و تازِ قوتِ ارادی اور حوصلہ مندی جیسی صفات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان اوصاف سے مزین افراد اجتماعی شعور میں برقی رو کی طرح موجود ہوتے ہیں، یہی افراد معاشرتی اور سماجی بیماریوں کے لئے تریاق کا کام کرتے ہیں ایسے افراد کی کمی نہیں جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہوتے ہیں، جو رضا کارانہ طور پر خود ساختہ تقدیر کے زندانی ہو جاتے ہیں اور جنہیں اپنی بے بسی، بے کسی اور مجبوری کی حکایتیں سنا سنا کر ایک Masochistic مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ان کے برعکس کم سہی، مٹھی بھر سہی ہمت اور جوانمردی کے وہ آفتاب اور ماہتاب ہوتے ہیں جو زندگی کی تاریکیوں کو کافور کر کے تاحدِ نظر بقعۂ نور بنا دیتے ہیں اور ہم سفید چھڑی کے ذریعے ایسے ہی افراد کو ہمیشہ اپنا حقیر سا خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ان ہمت اور حوصلے کے متوالوں میں ہمارے ایک دوست اخلاق عاطفؔ بھی ہیں جو علمی اور ادبی دنیا میں جانی پہچانی شخصیت ہیں، جنہوں نے پنجابی اور اردو ادب میں اپنی ندرتِ خیال اور جدتِ فکر سے نت نئے جھنڈے گاڑھے ہیں۔ اخلاق عاطفؔ 1986ء میں اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو گئے لیکن صاحبانِ ہمت کی طرح انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا بلکہ سفر اور تیز ہو گیا کہ اکثر و بیشتر ابتلاؤ آزمائش جوہرِ قابل کو نکھارنے میں طلسمی کارنامے سرانجام دیتی ہے۔ شیکسپیئر کے ایک کردار کے الفاظ میں

"Sweet are the uses of adversity"

اور بقول اقبال:

؂ خطر تاب وتواں را امتحان است
عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق عاطف پر جتنی مشکلات پڑیں ان کا حوصلہ اور بلند ہوتا گیا، کم سنی ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے، پھر بیماری نے آلیا جس سے ان کی بائیں ٹانگ ضائع ہو گئی اور بعد ازاں ان کے دل نے ان سے چھیڑ چھاڑ اور اٹھکیلیاں کرنی شروع کر دیں اور انہیں انجیو پلاسٹی کے عمل سے گزرنا پڑا۔لیکن ان کی ہمت اور حوصلہ کبھی کم نہیں ہوا، کثیر العیالی اور بہت سی دیگر مشکلات کے باوجود انہیں ہمیشہ ہر ادبی محفل میں، ہر علمی گفتگو میں، ہر خیر کے کام میں پیش پیش دیکھا گیا۔میں نے اخلاق کو 31۔اکتوبر 1980 میں پہلی بار سنا جب وہ میری رہائش گاہ پر منعقدہ مشاعرے میں اپنا کلام پڑھنے آئے اور ان کا شعر آج تک میرے ذہن میں گونجتا ہے اور زبان پر بھی بے ساختہ آتا رہتا ہے۔

؂ اک حقیقت کا گماں ہوتا ہے اپنی ذات پر
ہم نے بیعت کی ہے جب سے اک حنائی ہات پر

ہم نے اس حنائی ہاتھ کا کھوج تو نہیں لگایا لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس حنائی ہاتھ کی بیعت نے انہیں دستِ ہمت پر بیعت کرنے کی ترغیب بھی دی اور ہم نے دیکھا کہ پھر انہوں نے سرگودھا جیسے مضافاتی شہر میں ہوتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا، اردو اور پنجابی میں ان کے بہت سے شعری مجموعے شائع ہوئے۔انہیں 2003ء میں قومی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے ان کے پنجابی نعتیہ مجموعے "سیرت دا چانن" پر ایوارڈز ملے۔حال ہی میں انہیں ان کے ایک اور نعتیہ مجموعے "سبز بادل" پر قومی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا ہے، ہم انہیں اس کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔اخلاق عاطف کی کامیابیوں کے اور بھی بہت سے میدان ہیں، ان کی بہت سی غزلوں اور گیتوں کو بہت سے گلوکاروں نے ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کیا ہے۔ان کی

کامیابیوں کی دھوم پاکستان کی سرحد عبور کر کے بھارت تک پہنچ گئی ہے، وہ مسعود کھدر پوش ایوارڈ کے علاوہ اور بہت سے ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں اور اب انہیں بزمِ فکر و خیال سرگودھا کی طرف سے ایک شیلڈ بھی پیش کی جا رہی ہے، ہم ان کی ہمت کو سلام پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ یونہی اپنی تمام تر دل و دماغ کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے رہیں اور یہ ثابت کرتے رہیں کہ حوصلے اور عزم کے سامنے مشکلات کے پہاڑ بھی گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور فطرت ایسے اسباب پیدا کرتی ہے کہ دیکھنے اور سننے والے حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بقول شاعر

؂ مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

☆☆☆☆

یہ لوگ کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتے

یہ لوگ، یہ اشخاص، یہ اہلِ محلّہ، شہر والے اور خود اپنے گھر والے اگر نہ ہوں تو زندگی ویران ہو جائے، سب کچھ دشت و صحرا نظر آنے لگے اور پتھر کے انسان کی یاد تازہ ہو جائے لیکن یہی لوگ، یہی اشخاص، اہلِ شہر، اہلِ محلّہ اور اہلِ خاندان اگر اپنی من مانی کرنے لگیں، اپنے تجربات اور اپنے خیالات کی یورش کرنے لگیں تو زندگی تب بھی تڑپ کر، سسک کر اور بے جان اور بے روح ہو کر رہ جاتی ہے۔ دراصل فرد اور معاشرے کے مسائل ہمیشہ حل طلب رہے ہیں۔ اہلِ یونان نے ایتھنز اور سپارٹا کی سٹی سٹیٹ اسی لئے قائم کی تھیں کہ سب مل کر رہ سکیں، ایک دوسرے کے کام آئیں، تنہائیوں کو کافور کر دیں اور ضروریات کی فراہمی میں ایک دوسرے کی مدد کریں لیکن آہستہ آہستہ یہ سٹی سٹیٹس بڑی بڑی ریاستوں میں تبدیل ہو گئیں اور حکمرانوں کو اپنے فکر کے علاوہ کسی اور کی فکر دامن گیر نہیں رہی، حکومت کے عملداروں کا بارِ گراں اٹھا کر بھی فرد کو کوئی سہولت، کوئی آرام اور کوئی تسکین حاصل نہ ہوئی۔ State کی بات کو چھوڑیئے یہاں تو State کے اندر جانے کتنی States ہوتی ہیں، ریاست در ریاست، حکومت در حکومت۔ ہر آدمی جس کے پاس ذرا سی طاقت آ جائے وہ دوسرے کی زندگی اور موت کے بارے میں فتوے صادر کرنے لگتا ہے اور اپنی منشا اور خواہش کے مطابق دوسرے کو زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ فرد اور معاشرے میں جو ہم آہنگی اور یگانگت ہونی چاہیے تھی وہ بہت کم ہی پیدا ہوئی، ہاں مدینے میں جو ریاست قائم ہوئی تھی اس نے یہ ثابت کر دیا کہ فرد معاشرے کے لئے ہے اور معاشرہ فرد کے لئے، لیکن پھر خلافت، حکومت میں تبدیل ہو گئی اور حکومت آمریت میں اور پھر آمریت نے جس انداز سے جور و ستم تراشے ان کی داستان اب بھی جسموں پر لرزہ طاری کر دیتی ہے اور روحیں کانپنے لگتی ہیں۔ چلئے یہ تو بات ہوئی مطلق العنان فرمارواؤں کی جو اپنے آپ کو ظلِ الٰہی بلکہ سراپا خدا تصور کرنے لگے تھے اور ان کی خدائی میں صرف ان کی انا، ان کی خوشی اور ان کی اداؤں کی پوجا پاٹ ہوتی تھی لیکن آج کا

معاشرہ جہاں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ فرد بڑی حد تک آزاد ہو گیا ہے وہاں بھی فیصلے معاشرہ صادر کرتا ہے، وہ اپنے فیصلوں کو اگر عملی جامہ نہ بھی پہنا سکے تو اس کے پاس سنگ زنی کے سینکڑوں طریقے ہیں، طعنوں اور عیب جوئی سے عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ دیکھو فلاں کیسے جا رہا ہے؟ اس نے کیسا لباس زیبِ تن کیا ہوا ہے؟ وہ کس طرح ہنس رہا ہے؟ وہ کس طرح رو رہا ہے؟ وہ کس طرح دن گزارتا ہے اور کس طرح رات گزارتا ہے J.S.Mill نے اسے اکثریت کے جور سے تعبیر کیا تھا اور اس کی ساری کی ساری کوشش یہ تھی کہ کس طرح فرد کو معاشرے کے جور سے نجات دلائی جائے۔

اگر معاشرہ ہمدرد، بہی خواہ اور دوستانہ روش پر چل رہا ہو تو بات اور ہے لیکن ایسے میں بھی فرد کو زندگی تو ایک بار ملتی ہے وہ ایک بار کی زندگی بھی کسی کے ناز و غمزہ کی نذر کر دے تو زندگی کیا ہو گی۔ ہاں اگر یہ ناز و غمزے دل پر حکومت کرتے ہوں تو بات اور ہے لیکن وہ ناز و غمزے جن کی ایک جھلک خون آشام ہوتی ہے اور روح فرسا دکھائی دیتی ہے اور ان کے تابع فرمان زندگی گزارنا زندگی تو نہ ہوئی عذاب بن گئی۔ دورِ حاضر میں کسی کو کسی سے کم ہی سروکار ہوتا ہے۔ ساتھ والے گھر میں کیا قیامت بیت رہی ہے کسی کو علم نہیں، نہ یہ اس کی ضرورت ہے لیکن اگر وہ اپنی مرضی کا اسلوبِ حیات تراش لے، اپنی مرضی کا رفیقِ سفر منتخب کر لے اپنی خواہش کا پیشہ اپنا لے، اپنی خوشی سے جینا سیکھ لے تو جانے کتنی انگلیاں اٹھتی ہیں، کتنی نظریں جیتے جی موت کے منہ میں اتار دیتی ہیں۔

میرے ایک دوست جن کی عمر کوئی ستر سال سے زائد ہے ایک ایسی صورتِ حال میں گرفتار ہوئے کہ وہ کوئی رفیقِ سفر منتخب کر لیں لیکن انہیں یہ خوف کھائے جا رہا ہے "کہ کوئی کیا کہے گا" کوئی انہیں آ کر نہیں پوچھتا کہ کہو تم پر کیا بیت رہی ہے، کہو تمہارے روز و شب کیسے گزرتے ہیں، تمہارا کوئی پرسانِ حال ہے بھی یا نہیں۔ یہ تو ایک مثال ہوئی میرے سامنے ایسی سینکڑوں مثالیں ہیں جن میں آزاد اور خود مختار انسان معاشرے کے جبر میں مبتلا ہے، معاشرہ اپنے آہنی پنجے اس کے جسم میں کچھ اس طرح گاڑتا ہے کہ اس کی چیخ ہی نکل جاتی ہے لیکن وہ چیخ بھی نہیں سکتا

"کہ کوئی کیا کہے گا" یہ کوئی پندرہ بیس سال کی بات ہے کہ ایک ناروے کی ایک ناروجین، پاکستان آئے اور وہ سرگودھا میں مجھے بھی ملنے آگئے، وہ ناروے کی ایک نابینا افراد کی تنظیم سے منسلک تھے۔ باتوں باتوں میں، میں نے ان سے پوچھ لیا کہ وہاں نابینا حضرات کی ازدواجی زندگی کس طرح شروع ہوتی ہے، اس نے جواب دیا کہ اسی طرح جس طرح کسی اور کی۔ یورپ میں لاکھ برائیاں سہی لیکن وہ کسی کو جینے کے حق سے محروم نہیں کرتے اور کسی کی خوشیاں اور سکون اس طرح غارت نہیں کرتے جس طرح کہ وہ معاشرے جو اپنے آپ کو اعلیٰ روحانی اقدار کا ٹھیکے دار سمجھتے ہیں اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ ان روحانی اقدار کو جو دراصل ان کی قبائلی اور جاگیردارانہ اقدار ہوتی ہیں انہیں مذہبی احکام کا مقدس لبادہ پہنا دیتے ہیں۔ گویا ان کے احکام سے انحراف کرنا مذہب سے بیگانہ ہو جانا ہے، آج پاکستان میں جب کہ الیکٹرانک میڈیا بڑی حد تک آزاد ہے اور کچھ نہ کچھ کہنے اور سننے کی آزادی ہے لیکن اس آزادی کا تعلق صرف سیاست کاروں کی ٹانگ کھینچنے تک ہی محدود ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے کامیاب چینلز بھی ان مسائل کو زیرِ بحث نہیں لا سکتے نہ لاتے ہیں جن کا تعلق انفرادی آزادی اور عقائد کی حریت سے ہے، آپ حکومت کے خلاف بولتے رہیے لیکن اگر آپ قبائلی نظام کی پردہ دری پر جرأت کریں گے تو آپ پر جینا حرام کر دیا جائے گا اور پاکستان میں جانے کتنے "گوانتاناموبے" تعمیر ہو جائیں گے بلکہ پہلے ہی سے تعمیر ہیں جن کے بارے میں کسی کو علم ہوتا ہے کسی کو نہیں۔

اسلام جیسی روح پرور، عافیت آفریں اور انسانیت نواز تعلیمات کو جس بھونڈے انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کے بارے میں سوچ کر بھی گھن سی آنے لگتی ہے۔ وہ مذہب جو آفاقی تھا، بین الاقوامی تھا اور ہر زمانے کے لئے تھا اسے چند رسوم و رواج کا چولا پہنا دیا گیا ہے اور چولا پہنانے والے وہ لوگ ہیں جو خود اس کی روح سے واقف نہیں۔ جس کی روح نے کئی زندگیاں جنم دی تھیں اور ریگستانِ عرب کو چمنستان بنا دیا تھا، جہنم زارِ حیات کو جنت میں تبدیل کر دیا تھا، جہاں جینا رحمت تھا، جہاں رہنا زندگی تھا۔ بدقسمتی سے اس خدائی اور آفاقی مذہب کی تشریحات ان کے

حصے میں آئیں جنہیں بین الاقوامیت، آفاقیت اور انسانیت کا بہت کم علم تھا ایسے میں اگر کچھ مردانِ حق پیدا بھی ہوئے تو ان کی آوازوں کو کچل دیا گیا، انہیں نیست و نابود کر دیا گیا، ایسے محققین اور مجتہدین کی کمی نہیں رہی جنہوں نے مذہب کی اصل روح کو پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا دائرہ اصل ذاتی منفعتوں اور ذاتی مفادات رکھنے والوں نے محدود کر کے رکھ دیا اور اپنی من چاہی اور من مانی تشریحات پیش کیں اور وہ خود اگر ایسا نہیں کر سکے تو انہوں نے جانے کتنے "علی وجودی" تخلیق کر لئے، اپنی مرضی کے شارحین اور مفتیانِ اعظم کی خدمات حاصل کر لیں اور انہیں سونے میں تولنے لگے اور انہوں نے بھی فرائض کو بڑی سعادت مندی سے سرانجام دیا، یوں جاگیرداروں کی جاگیریں قائم رہیں، درگاہیں آباد رہیں اور ذاتی مفادات خوب پھلتے پھولتے رہے، معاشرے کی اس بھیانک شکل کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ فرد کی آزادی کے دن ابھی بہت دور ہیں لیکن شمعِ امید کو ہمیشہ جلتے رہنا چاہیے اور کوششیں جاری رہنی چاہئیں تا کہ فرد اپنی نجی زندگی میں ہی سہی کچھ تو آزادی سے ہمکنار ہو۔ ایک فرد کی مضبوطی ہی معاشرے کی مضبوطی ہوتی ہے، کھوکھلے افراد کھوکھلے معاشرے کو جنم دیتے ہیں پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے فرد کو اپنی خودی کی حفاظت کرتے رہنا چاہیے، اپنی ذہنی صلاحیتوں کی صلابت پر توجہ رکھنی چاہیے اور راہ کی مزاحمتوں کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔ مانا کہ یہ راہ بڑی مشکل ہے لیکن اس کے نتائج مثبت ہوں گے، ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی کیا کہے گا، ہمیں کس انداز سے دیکھے گا بلکہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنی ذات اور اپنی شخصیت کو بالکل ہی نیست و نابود نہ ہونے دیں بلکہ اس کی تعمیر کی کوئی راہ نکالیں تا کہ مستقبل محفوظ ہو سکے اور فرد اور معاشرہ خوشی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھ سکیں۔

☆☆☆☆

''نازوالے نیاز کیا جانیں''

''نازوالے نیاز کیا جانیں'' یہ مصرعہ ذہن میں آتے ہی کسی ایک اور شعر کا مصرعہ ''جس پہ گزری نہ ہو وہ کیا جانے'' ذہن میں آجاتا ہے۔ شومئی قسمت سے کچھ ہوتا یوں ہے کہ انسان اپنی ذات کے خول میں بند رہتا ہے اور اس سے نکل کر ادھر ادھر دیکھنے کی صلاحیت کم و بیش مفقود ہو جاتی ہے۔ اقبال نے تو خودی کی بات کی تھی لیکن پھر اقبال نے تو بے خودی کا بھی ذکر کیا تھا یعنی یہ کہ فرد اور معاشرہ دونوں اہم ہیں اور دونوں میں ایک ربطِ باہمی از بس ضروری ہے لیکن ہوتا کچھ یوں ہے کہ بس ہم اپنے من کی دنیا میں اپنے ہیرو ہوتے ہیں۔ اگر ہم خوش ہیں تو تمام عالم خوش ہے اور اگر ہمیں ذرا سا دکھ ہوا تو دنیا جہنم بن گئی بس اپنے من میں ایک عالم بسائے ہوئے ہوتے ہیں اسی میں جیتے ہیں اور اسی میں مرتے ہیں ہماری بلا سے ہمارا کوئی ساتھی مر رہا ہو کہ جی رہا ہو۔ کیٹس نے اپنی ایک شاعرانہ ترنگ میں کہا تھا کہ:۔

When I look at a Sparrow I takepart in its existence.

یعنی جب میری نظر ایک چڑیا پر پڑتی ہے تو میں اس کے وجود کا حصہ بن جاتا ہوں، کیٹس نے کیا خوب کہا تھا اور اس کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کم و بیش ایسا ہی کرتا تھا، اسی طرح شیلی نے اپنے ایک تنقیدی مضمون '' Defence of Poetry'' میں کہا تھا کہ ''ایک شاعر ہزاروں لوگوں کے وجود میں سانس لیتا ہے'' یہی حال ورڈز ورتھ کا تھا وہ تہی دستوں، خستہ حالوں اور خستہ تنوں کے ساتھ جیتا تھا اور ان کے دکھ بانٹتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ کچھ یوں ہوا کہ زندگی نے کئی کروٹیں لیں، ہر آدمی آہستہ آہستہ یا تو خود کفیل ہو گیا یا اپنے آپ کو خود کفیل سمجھنے لگا۔

اور یوں وہ اپنی اَنا کے خول میں بند ہو کر رہ گیا اور پھر یہ کسی فرد پر ہی کیا موقوف قوموں کا بھی یہی حال ہو گیا، جب علامہ اقبال 1905ء میں یورپ گئے تو ان پر منکشف ہوا کہ یورپی

ممالک کو نسل پرستی، مفاد کیشی اور عصبیت کا اژدھا نگل رہا ہے اور وہ ڈاکوؤں کا ایک ٹولا بن کر رہ گئے ہیں، علامہ نے اس رجحان کے ہولناک نتائج کی پیشین گوئی کر دی تھی اور پھر جنگِ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوم برپا ہوئیں، یہ جنگیں کسی قیامت سے کم نہ تھیں لیکن انسانیت نے ان جنگوں کی تباہ کاریوں سے کچھ زیادہ نہیں سیکھا، ہاں بڑی طاقتوں نے اتنا ضرور سیکھ لیا کہ خود نہیں لڑیں گے بلکہ لڑوائیں گے اور یہ سبق انہیں بڑی اچھی طرح ازبر ہو گیا ہے اور ہر ملک اپنے مفادات کے حصار میں اسیر ہے۔ امریکہ جس کے ناز او نخرے کا کوئی بدل نہیں اپنے حسن سے جانے کس کس کو گھائل کر رہا ہے، اس کا یہ حسن پھیلتا جا رہا ہے، اس کی جوانی کو کہیں قرار نہیں، یہی حال ہندوستان کا ہے اور پھر ہندوستان پر ہی کیا موقوف خود ہم نے بھی یہی نعرہ بلند کیا تھا کہ ''سب سے پہلے پاکستان''۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے وطن کی محبت جزوِ ایمان ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اپنے وطن کی محبت ہمیں اس قدر خود غرض بنا دے کہ ہم دوسروں کے دکھوں اور مسائل سے بالکل بے پرواہ ہو جائیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اپنے دو تین ہزار سالوں میں کچھ نہیں سیکھا اور تہذیب و شائستگی کے کھوکھلے نعرے بلند کرتے رہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ نازوالے نیاز کی کیفیت کو سمجھیں، حسن والوں کو یہ معلوم ہو کہ ان کا حسن کسی کے لئے عذابِ دیدہ و دل نہ بنے بلکہ تسکین و راحت کا باعث ہو، یہ نازوادا صرف حسن کی نہیں ہوتی، طاقت کی بھی ہوتی ہے اور طاقت سے زیادہ کون حسین ہوتا ہے، آج آپ کے پاس حسن ہے، دولت ہے، ذرائع ہیں، سب کچھ ہے، لیکن یہ ادائیں، یہ حالات تو بڑے وقتی ہوتے ہیں، روما کی سلطنت خاکستر ہو گئی اور ایران کی عظمت جاتی رہی، روس پارہ پارہ ہو گیا یہی حال افراد کا بھی ہوتا ہے، آج جو سب کی آنکھوں کا تارا ہے کل ممکن ہے اس کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ ہو، اس لئے صاحبانِ نازوادا کو اپنے خول سے نکل کر اپنے اردگرد دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے لیکن بدقسمتی سے ایسا ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔ ہاں! لوگ باتیں اچھی کر لیتے ہیں، جاگیردار اور سرمایہ دار مفلس و تہی دست لوگوں پر خوب خوب لفظی آنسو بہاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ وہ

انہی کےتو ہمدرد ہیں، انہی کے لئے جیتے ہیں، انہی کے لئے مرتے ہیں اور یوں مفلس و بے سہارا لوگوں کے جذبات سے کھیل کر اپنی سیاست چمکاتے ہیں، یہی حال اربابِ قلم و قرطاس کا ہے، گلی کوچوں میں خاک اڑاتے ہوئے عوام الناس پر دل ہلا دینے والے کالم لکھ کر اپنے نان و نفقہ کا اہتمام کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ خود تو زندگی کی تمام نعمتیں سمیٹنے لگتے ہیں لیکن گلی کوچوں میں خاک چھاننے والوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، طاقت اور قلم کا یہ استحصال جانے کب سے جاری ہے اور جانے کب تک جاری رہے گا۔ یہ صلاحیت جانے کب نمو پذیر ہوگی کہ طاقتور کمزور سے سچ مچ محبت کرنے لگے اور مفلسی کے گیت گانے والے مفلسوں کے لئے سچ مچ سوچنے لگیں اور کچھ کرنے لگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی حالت اس وقت تک نہیں سنور سکتی جب تک کہ لفظوں کے جادو کے ساتھ ساتھ عمل کا جادو اپنے معجزے نہیں دکھاتا، ہم سب کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ ہم نے زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کتنا کردار ادا کیا ہے، ہم نے عملی طور پر کتنے دلوں کو سہارا دیا ہے، کتنی آنکھوں کے آنسو پونچھے ہیں، کتنے گھروں کو چھت فراہم کی ہے، کتنوں کا تن ڈھانپا ہے، کتنوں کے نان و نفقہ کا اہتمام کیا ہے اور زندگی کو کتنا وقار عطا کیا ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے یہ ماضی کی دین ہے، کچھ اچھے لوگوں کے کارنامے ہیں، ہمیں اس کا عملی تشکر ادا کرنا چاہیے اور اچھی روایات کو برقرار رکھنا چاہیے، اپنی ذات کے حصار سے نکل کر اپنے ماحول کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ دنیا کو عالمی گاؤں کہنے والے شاید اس امر سے واقف نہیں کہ دنیا والوں کی حالت میں تو کوئی تبدیلی آئی ہی نہیں۔ وہی گرانی ہے، وہی عسرت ہے، وہی نانِ شبینہ کی تلاش ہے اور وہی ضرورتیں اور حاجات۔ ہماری رائے میں نقطۂ نظر کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے تبھی دنیا رہنے کی جگہ بن سکتی ہے، تمام مذاہب کی یہی روح ہے اور مہذب ہونے کا یہی تقاضا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

یوں تو تغیر اقتضائے فطرت ہے، مستحسن ہے، بلکہ انسانی ارتقاء اور فوز و فلاح کا ضامن ہے اور آفرینشِ بنی آدم سے تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں، تاہم ایک زمانہ تھا اور کوئی زیادہ دور کا بھی نہیں جب تبدیلی اور تغیر کو منحوس تصور کیا جاتا تھا، ازمنۂ وسطیٰ میں تو اسے گناہ گردانا جاتا تھا لیکن پھر تغیر و تبدل کی قوتیں جلوہ افروز ہوئیں اور زندگی میں تحرک نظر آنے لگا، نئے دور کا آغاز ہوا، یہ سلسلہ جاری و ساری ہے اور جاری و ساری رہنا چاہیے۔ لیکن کچھ لطیف اور حساس گوشے ایسے بھی ہیں جہاں تغیر و تبدل روح فرسا اور اندوہ گیں نظر آتا ہے اور یہ گوشے انسان کی جذباتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں ہم بسا اوقات رنگوں کو ہمیشہ دل کش اور آوازوں کو ہمیشہ جاں آفریں دیکھنا چاہتے ہیں، اپنے بچوں کی مسکراہٹوں، ان کے قہقہوں اور ان کی معصومیت کو اپنے دل میں ہمیشہ کیلئے بسا لیتے ہیں لیکن جب یہ مسکراہٹیں یہ قہقہے کرخت ہونے لگتے ہیں اور یہ معصومیتیں چالاکیوں میں تبدیل ہوتی ہیں تو دل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، وہ چہرے جو ہمیں دیکھ کر دمک اٹھتے تھے، وہ لب جو ہمارے اشارے پر کھل اٹھتے تھے وقت کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ ایسا تغیر واقع ہوتا ہے کہ ایسا لگنے لگتا ہے کہ وہ چہرے، وہ آنکھیں، وہ لب و رخسار بالکل بدل گئے ہیں ان میں جاذبیت، دلکشی اور دل داری کہیں کھو گئی ہے یہ زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے اس المیے کا اندازہ شیکسپیئر کے بعض کرداروں سے ہوتا ہے کہ بروٹس خود سیزر کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا ہے اوتھیلو خود ڈس ڈی مونا کو موت کی آغوش میں سلا دیتا ہے اور ایک بروٹس اور اوتھیلو پر ہی کیا موقوف ہم اپنے اردگرد اپنے کتنے پیاروں کو اپنا دشمنِ جاں دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں اور سوچتے ہیں بُرا ہو ان مصلحتوں کا اور ان خود غرضیوں کا جو اپنوں کو اپنوں سے جدا کر دیتی ہیں، اپنوں کو غیر بنا دیتی ہیں اور پھر سب کچھ شکم پروری میں تبدیل ہو جاتا ہے، ذاتی مفادات، محبت اور خلوص کو نگل جاتے ہیں، لطیف جذبات مصلحتوں کی بھینٹ چڑھنے لگتے ہیں، جب یہ المناک اور اندوہ پرور مناظر

ہمارے اردگرد ہوتے ہیں تو پھر زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، خوشیوں کے پھول کسمسا اٹھتے ہیں اور جاں بلب دم توڑ دیتی ہیں اور پھر ہم Timon of Athens کی طرح زندگی سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور غارت گروں کے ہاتھ میں اپنی دولت تھما کر کہہ اٹھتے ہیں کہ اس کے بدلے سب کو قتل کر دے کہ نا سپاسی کے بیج ہی اگنے نہ پائیں۔ King Lear اپنی دو بیٹیوں Goneril اور Regan کو اپنی پوری سلطنت دے دیتا ہے لیکن وہ سلطنت کے حصول کے فوراً بعد اپنے بوڑھے باپ کو طوفانوں کے حوالے کر دیتی ہیں، نا سپاسی اور بے مہری کی یہ اندوہناک کہانیاں دنیا میں بھری پڑی ہیں لیکن یہ بات یاد رکھی جانی چاہیے کہ یہ رویے وبائی ہوتے ہیں یہ پھیلتے رہتے ہیں پھلتے پھولتے ہیں اور ان سب کی وبا کا شکار وہ لوگ بھی ہو جاتے ہیں جنہوں نے اس کو جنم دیا ہوتا ہے، اس کی پرورش کی ہوتی ہے جب سارا ماحول خود غرضیوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے تو کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، اچھی مثالیں اچھے لوگوں کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اچھے Ideals قائم کئے جائیں اور حال کی چمک دمک میں ماضی کی معصومیت اور ماضی کی لطافت کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے، یقیناً آج کا بچہ کل کا باپ ہوگا اور اگر بچہ اپنی معصومیت بالائے طاق رکھ کر خود غرضی کا شکار ہو جاتا ہے تو کل اسے بھی اسی صورت حال سے دوچار ہونا ہوگا۔

المیہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے ماضی کو نظر انداز کر دیتا ہے اور بہت کم مستقبل کی فکر کرتا ہے، وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جو سلوک وہ دوسروں سے کر رہا ہے اس کا شکار وہ خود بھی ہو سکتا ہے بلکہ اکثر و بیشتر ہو جاتا ہے، نا سپاسی کی یہ مثالیں زندگی کو المناک بنا کر رکھ دیتی ہیں اور رشتوں کا تقدس باقی نہیں رہتا، ویسے صرف رشتوں پر ہی کیا موقوف پوری انسانیت اللہ کا کنبہ ہے، سب آدم کی اولاد ہیں اور ایک ہیں لیکن ہماری خود غرضیاں اور کوتاہ اندیشیاں ہم سے بصیرت چھین لیتی ہیں اور ہمیں خود غرض بنا دیتی ہیں، ہم سے اعلیٰ اقدار چھن جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ زندگی عذاب بن کر رہ جاتی ہے، ہر مذہب نے محبت اور اخوت کی دعوت دی ہے، ہر تہذیب نے مساوات اور ہمدردی کا علم بلند کیا ہے، ہر دانشور باہمی اتفاق اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے، آسمانی کتابیں، زمینی دانش

اور تجربہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ محبت فاتح عالم ہے، پیار زندگی کی اساس ہے، عدل بقائے حیات کا ضامن ہے لیکن اس کے باوجود دنیا روزانہ قیامتِ صغرا کے مناظر پیش کر رہی ہے اور ہمارے اپنے دوست، ہمارے اپنے ساتھی، ہمارے چاہنے والے اور ہمارے مداح ہمارے دشمن بن رہے ہیں اور ہم خود بھی تو اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے، ہم خود بھی بہت کم سوچتے ہیں کہ کہیں ہم وہی کچھ تو نہیں کر رہے ہیں جس کی ہم شکایت کرتے ہیں، دراصل ہر انسان کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ رہنی چاہیے کہ ہر شخص اسی جیسا ہے اس کے جذبات اور احساسات بھی اسی جیسے ہوتے ہیں۔ ہر شخص پیار چاہتا ہے، محبت چاہتا ہے، انصاف چاہتا ہے اور بھائی چارے کی فضا میں رہنا چاہتا ہے لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ اس فضا بندی میں، اس ماحول کی تعمیر میں اس کا اپنا کتنا کردار ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ معاشرہ افراد سے بنتا ہے اگر ہر فرد اپنے مقدر کا ستارہ بننے لگے، محبت کا علم تھام لے اور پیار کا پرچم بلند کرے تو زندگی محبتوں کا گہوارہ بن سکتی ہے اور دنیا ایسی جنت بن سکتی ہے جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، پیار ہی پیار ہو، فلاح ہی فلاح ہو لیکن شومئی قسمت سے ایسا نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی، قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی اور زندگی کی گھٹن جانے کتنے عارضوں کو جنم دیتی ہے، کہیں ذہن بیمار ہو جاتا ہے تو کہیں دل میں افسردگی جنم لے لیتی ہے، بے عملی پیدا ہوتی ہے اور پھر ہسپتال بھرنے لگتے ہیں اور ہر طرف عفونت ہی عفونت نظر آتی ہے۔ خود غرضی کا وائرس ایسا کینسر ہے جس کا علاج موجودہ حالات میں ممکن نہیں لیکن چونکہ ہم ممکنات کی دنیا میں رہتے ہیں اس لئے ہمیں یہ باور کر لینا چاہیے کہ صرف انفرادی سوچ کی تبدیلی سے سب کچھ تبدیل ہو سکتا ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ معاشرے انفرادی ہی کی کاوشوں سے فوز و فلاح سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اگر ہر فرد یہ تصور کر لے کہ وہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا تو تمام معاشرہ مفلوج ہو جائے گا۔

آیئے! محبت کی شمعیں روشن کریں، پیار کے چراغ جلائیں، اپنے بزرگوں کی عزت کریں، اپنے بچوں سے شفقت سے پیش آئیں، اپنے پڑوسیوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوں،

اپنے شہر اور اپنے ملک کو محبتوں کا گہوارہ بنا دیں، اس کرۂ ارض کو انسانوں کے رہنے کی ایسی جگہ بنائیں کہ خدا خود کہہ اٹھے کہ فرشتو! تم نے دیکھا کہ میرا انسان کتنا قابلِ تعظیم اور قابلِ احترام ہے، کتنا پیارا اور کتنا دل کش ہے اور زمین پر میرا خلیفہ ہونے کا بجا طور پر مستحق ہے۔ جب یہ صفات اپنائی جائیں گی تو پھر نہ صرف اپنے، اپنے رہیں گے بلکہ بے گانے بھی اپنے بن جائیں گے اور ایسی خوفناک تبدیلی کا ڈر نہیں ہوگا کہ اپنے پیاروں کے چہروں کو دیکھ کر بھی ان کی شناخت نہ ہو سکے اور پھر شاعر کے لبوں پر یہ شکایت نہیں ہوگی

ے ہر قدم پر اک نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

☆☆☆☆

کب رات بسر ہوگی

آس کا چاند، امید کے ستارے اور توقع کی کہکشاں یقیناً رات کی تاریکی کو کافور کر دیتے ہیں اور انسان صبح کا انتظار بڑے حوصلے اور بڑی جواں مردی سے کرتا ہے۔ رات تسکین آفریں اور راحت افزاء ہو جاتی ہے لیکن یہ چاند ستارے اور کہکشائیں وقتِ معیّن تک قائم رہتی ہیں اور پھر صبح کے ستارے کو طلوع ہونا ہی ہوتا ہے لیکن اگر صبح کا ستارہ طلوع نہ ہو، صبحِ روشن کی کوئی توقع نہ ہو اور رات طویل تر ہوتی چلی جائے تو پھر آس، امید اور توقع اپنی توانائی کھو بیٹھتے ہیں تاہم آس کے دامن کو ہمیشہ تھامے رکھنا چاہیے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ زمینی حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور محض امید اور آس پر زندگی بتا دی جائے۔

پاکستانی سیاق و سباق میں بات کرتے وقت کچھ اس طرح کی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے، کتنی آس اور امید کے ساتھ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی طلوع ہوئی تھی ہر ایک امید اور آس لئے اپنی توانائیوں کا بھرپور استعمال کر رہا تھا۔ فرانسیسی انقلاب کے اولین دنوں کی طرح ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ حسین ہے، سب کچھ دلکش ہے، تمام مشکلات اور دقتیں پرِ کاہ نظر آتی تھیں، امید کا چراغ روشن تھا، یہ خیال تھا کہ بہت جلد غلامی کی رات دم توڑ دے گی اور آزادی کی صبح طلوع ہو جائے گی، دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ درست ہو جائے گا، ساری خوشیاں ہماری جھولی میں ڈال دی جائیں گی، ہم ہوں گے اور زندگی کے گیت ہوں گے۔ وہ صبح 14۔ اگست 1947ء کو طلوع ہو گئی لیکن پھر کیا ہوا؟ کون نہیں جانتا! ''شہاب نامہ'' کے قارئین ان حقیقتوں سے اچھی طرح آشنا ہیں، شہاب نامے پر ہی کیا موقوف ہم نے بھی بہت کچھ دیکھا اور سنا، جو حکومت آتی تھی وہ حسین سپنے دکھاتی اور غائب ہو جاتی، حکومتوں کی تبدیلی کھیل تماشا بن گئی تھی، پھر فوج نے مداخلت کی اور مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ جمہوریت پسند طاقتوں نے محسوس کیا کہ اگر انہیں پھلنے پھولنے کا

موقع دیا جاتا تو صورتِ حال کہیں بہتر ہوتی، جمہوریت پسند قوتوں کی جیت ہوئی اور پھر انہی جمہوریت کے پجاریوں نے فوج سے روابط بڑھانا شروع کر دیئے اور انہیں اپنا مسیحا گردانا، فوج پھر در آئی اور پھر جمہوریت آئی اور پھر فوج اور اب پھر جمہوریت۔ ان تمام تبدیلیوں اور انقلابات کے باوجود پاکستان انہی خطرات سے دوچار ہے جن سے وہ اپنے قیام کے وقت تھا، ہندوستان کی ریشہ دوانیاں اب بھی جاری ہیں، مغربی طاقتیں اب بھی پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتی ہیں، خود درونِ ملک صورتِ حال بڑی گمبھیر ہے، بڑی نازک! اب بھی من حیث القوم ہم میں اتحادِ فکر و نظر کا فقدان ہے۔

اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کبھی ہم سیاست دانوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں تو کبھی عساکرِ پاکستان کو، کبھی اپنے پڑوسی ممالک کو اور کبھی اشتراکیت اور سرمایہ داری کو، اس میں کلام نہیں کہ کمزور اقوام کو بہت سی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، جب ان کے جسم کی مدافعتی قوت کم ہو جاتی ہے تو پھر بیرونی عوامل اثر انداز ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ کئی وائرس، کئی جراثیم اور کئی عوارض سر اٹھاتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ صورتِ حال کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت عوام کی ناخواندگی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتی ہے اور عوام حاکموں کے لالچ اور حرص کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر کوئی بھی نہیں دیکھتا۔ ہماری رائے میں حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اچھی حکمرانی کو یقینی بنائے اور معاشرتی انصاف قائم کرے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اکیسویں صدی ہے اور ہر شخص کو اپنے مقدر کا ستارہ ہونا چاہیے، ہر فرد کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہیے اور اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت کو معاشرتی برائیاں ختم کرنی چاہئیں لیکن کیا یہ ٹھیک نہیں کہ خود معاشرے کو اپنے اعمال کا احتساب کرنا چاہیے۔ امیر غریب کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے اور غریب امیر کو، استحصال ہر طبقہ کر رہا ہوتا ہے، مزدور نہیں چاہتا کہ وہ دلجمعی سے کام کرے، دوکاندار چاہتا ہے کہ وہ راتوں رات امیر ہو جائے، دفتر کے اہلکاروں کی خواہش ہے کہ وہ جس طرح ممکن ہو دولت اکٹھی کر لیں۔ یوں حاکموں پہ الزام دینے والے خود بھی

موردِ الزام ٹھہرتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ اس وقت چوری ترک کریں جب آپ کو ہاتھ کاٹے جانے کا خطرہ ہو، آپ ملاوٹ اس وقت بند کریں گے جب آپ کی پیٹھ پر کوڑے برس رہے ہوں، آپ رشوت لینا اس وقت بند کریں جب آپ کو سزا کا خوف ہوگا، کیا انسانی ضمیر اس قدر سو گیا ہے کہ وہ برے بھلے کی تمیز خت ہی نہیں کر سکتا؟ اگر دودھ میں ملاوٹ کرنے والا گوالا اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے تو پھر اربابِ اقتدار بھی تمام تر بے اعتدالیوں کے باوجود اپنے آپ کو معصوم قرار دے سکتے ہیں۔ دراصل نیکی اور اچھائی ہر شخص کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آپ اپنے ضمیر کو بیچنا شروع کر دیں، آپ اپنے خدا اور اس کے رسول کے احکامات کو بالائے طاق رکھ دیں، آپ گڈ گورننس کی بات کہہ سکتے ہیں، آپ حکومتی اداروں کے فرائض کی اہمیت بیان کر سکتے ہیں لیکن آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر شخص کے اندر ایک نگران موجود ہوتا ہے، ایک سپروائزر ہوتا ہے، ایک حاکم ہوتا ہے اور جب کوئی فرد اس کی بات سننا بند کر دیتا ہے تو وہ فرد اپنی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے اور چند سکوں کے عوض بک جاتا ہے۔ ہماری رائے میں موجودہ صورتِ حال کا تقاضہ ہے کہ ہم اصلاح کا آغاز اپنی ذات سے کریں۔ کیا ضروری ہے کہ میں تدریس کے عمل میں سکول کے ہیڈ ماسٹر یا کالج کے پرنسپل کی سرزنش کے خوف کو ملحوظِ نظر رکھوں یا اس کی تعریف و توصیف کی وجہ سے اپنے فرائض انجام دوں۔ نہیں ایسا نہیں! مجھے خود معلوم ہونا چاہیے کہ یہ میرا فرض ہے جو مجھے ادا کرنا ہے، مجھے اپنے ضمیر کو حساب دینا ہے، ہر شخص خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہو اسے اس بات کا منتظر نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی آ کر کہے کہ اٹھو اپنا فرض بجا لاؤ ورنہ تمہیں سزا ملے گی، دیکھو کام کرو تمہارے کام سے میں خوش ہوں گا، اعلیٰ اخلاقیات اس طرح کے ایسے رویے کی متقاضی ہیں کہ ہمیں از خود فرض کا احساس ہو، اپنی ذمہ داری کا علم ہو کیونکہ ہمیں ہر عمل کا اپنے ضمیر کو جواب دینا ہے۔ اپنے خدا کو جواب دینا ہے، یہ جو ہم پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں قرآن پڑھتے ہیں اور دیگر عبادات سر انجام دیتے ہیں ان کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکیں اور خلقِ خدا کا بھلا کر سکیں۔ اگر ہم اپنے فرائض صحیح ادا نہیں کرتے

تو کوئی عبادت اور کوئی نیکی ہمارے کام نہیں آسکتی، جب تک ایسا رویہ پوری قوم میں پیدا نہیں ہوتا قوم زندہ نہیں رہ سکتی اور تاریک رات صبح روشن میں تبدیل نہیں ہو سکتی، محض آس لگائے رکھنا کہ کوئی غیبی قوت آ کر ہمارے دن پھیر دے گی غیر اسلامی طرزِ عمل ہے۔ ہماری آس اور ہماری امید تو یہ ہونی چاہیے کہ نیکی خود اپنا اجر ہے، اگر ہم اپنا طرزِ عمل نہیں بدلتے تو ہم من حیث القوم زندہ نہیں رہ سکتے۔ ضروری ہے کہ ہم کسی اور کو اس کے فرائض سمجھانے کے بجائے اپنے آپ کو سمجھائیں کہ ہمارے فرائض کیا ہیں؟ ہم سب جانتے ہیں کہ جیسی رعایا ہوتی ہے ویسے ہی اس کے حکمران ہوتے ہیں، حکمران آسمان سے نازل نہیں ہوتے وہ اسی معاشرے کی پیداوار ہوتے ہیں اور اسی میں وہ پلے بڑھے ہوتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے معاشرتی رویوں پر نظر ثانی کریں، ہم ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کرنا سیکھیں، اپنے آپ سے انصاف کریں، اپنے اعزا و اقربا سے انصاف کریں، ہم اہلِ محلہ اور اہلِ شہر سے انصاف کریں، جب ہم ایک دوسرے سے انصاف کریں گے تو پھر انصاف کا بول بالا ہو گا، انصاف پھلے پھولے گا پھر کوئی حاکم، کوئی عسکری قوت، کوئی سیاستدان ہماری زندگیوں سے نہیں کھیل سکے گا، ہمارے مستقبل کو خطرے میں نہیں ڈال سکے گا، ہمارے حصے کی خوشیاں ہم سے نہیں چھین سکے گا اور جب انصاف، عدل اور سچائی ہمارا اوڑھنا بچھونا بن جائیں گے تو زندگی مسکرا اٹھے گی، رات کٹ جائے گی، اندھیرے چھٹ جائیں گے، خوشی کی صبح طلوع ہو گی، انصاف کا سورج اپنی روپہلی کرنیں بکھیرے گا اور پھر استحصالی قوتیں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔ تاریخ نے ایسا ہوتے دیکھا ہے، تاریخ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک اجڈ، ناخواندہ، بے اصول قوم کیسے خواندہ، با اصول اور مہذب بن گئی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور ہماری تاریخ بھی دہرائی جا سکتی ہے اور ہم پھر ایک بار زندہ قوموں کی صف میں عزت کا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عمل کو اصولِ حیات بنایا جائے، محض خالی خولی نعروں سے کام نہ لیا جائے اور وعظ و نصیحت پر اکتفا نہ کیا جائے۔ واعظ و نصیحت بہت ہو چکی

ہے اب سب کو مل کر قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانا چاہیے تا کہ وہ خواب جو اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ پاکستان جو قائدِ اعظم کی کوششوں سے معرضِ وجود میں آیا تھا اس کی بازیافت ہو سکے، قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہر سیلِ حوادث کا مقابلہ کرے اور ثابت کر دے کہ ابھی اس میں زندگی باقی ہے، غیرت موجود ہے اور حمیت ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆☆

حجِ اکبر

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اگر کسی کو اس ناقابلِ تردید اور آفاقی حقیقت کا یقین آجائے کہ کسی کا دل رکھنا، کسی کا دکھ بانٹنا، کسی کو خوش کرنا، کسی کے تاریک لمحوں میں شمعِ امید روشن کرنا اور کسی کے دل میں اعتماد کے چراغ جلا دینا کتنا اہم اور اللہ کو کس قدر پسند ہے، تو شاید ہر وقت اسی کو وظیفۂ حیات بنا لے لیکن جانے ہم میں سے ہر ایک تالیفِ قلبی اور دلجوئی کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو اس کا حق ہے اور ہمہ وقت اپنے دل کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے یا شاید اپنی اغراض کا اُلو سیدھا کرنے میں منہمک رہتا ہے اور اس حقیقت سے صرفِ نظر کر جاتا ہے کہ ہم اپنا دل اس وقت تک خوش نہیں رکھ سکتے جب تک کہ ہمیں دوسروں کے دلوں کی فکر نہ ہو کیونکہ آزردگی اور افسردگی ایک وبائی مرض ہے، یہ چھوت کی بیماری ہے جو ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو لاحق ہوتی ہے۔ آپ اپنے دفتر، اپنے گھر اور محلے میں افسردگی اور پژمردگی کے جراثیم چھوڑ دیں اور آپ دیکھیں گے کہ چند روز ہی میں آپ خود بھی اِن مہلک جراثیم کا شکار ہو جائیں گے اور آپ کی قوتِ مدافعت گھٹنے ٹیک دے گی۔ لیکن دل کے خوش رکھنے کے جنون میں ہم دماغ کی صلاحیتوں سے استفادہ بھی بند کر دیتے ہیں، دماغ اگر کبھی کہے بھی کہ خودغرضی افسردگی کو جنم دیتی ہے تو ہم یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کیونکہ ہم نے اپنے اردگرد معصوم دل کے اردگرد خودغرضی کا جالا تن لیا ہوتا ہے اور ہم اتنے مصلحت پسند ہو جاتے ہیں کہ ہمیں بس صرف اپنی ذات ہی دکھائی دیتی ہے اور کائنات کو بھول جاتے ہیں اگر کوئی ہمارا بھلا بھی کرتا ہے، ہمارے دکھ بھی بانٹتا ہے تو ہم اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ ناسپاسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ناسپاسی کے اتنے گھناؤنے جرم سرزد ہوئے ہیں کہ حساس دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ سولہویں صدی کے شہرۂ آفاق شاعر اور

ڈراما نگار شیکسپیئر نے اپنے ایک ڈرامے King Lear میں ایک بادشاہ کو سب کچھ اپنی بیٹیوں کے حوالے کرتے ہوئے پیش کیا ہے گو "کنگ لیئر" اپنی بیٹیوں سے اس قدر ٹوٹ کر پیار کرتا ہے کہ وہ انہیں سب کچھ دے دینا چاہتا ہے لیکن ایک ذرا سی غلط فہمی کے باعث وہ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو وراثت سے محروم کر دیتا ہے اور سلطنت دو بڑی بیٹیوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور جونہی وہ اپنی سخاوت کا مظاہرہ کر چکتا ہے تو بڑی بیٹیوں کے تیور ہی بدل جاتے ہیں، پل بھر میں برسوں کی محبت کافور ہو جاتی ہے اور وہ اپنے باپ کو طرح طرح کی اذیتیں دینا شروع کر دیتی ہیں یہاں تک کہ اسے زندگی سے ہی محروم کر دینا چاہتی ہیں۔ بیٹیاں بیٹوں کے مقابلے میں زیادہ نرم دل اور محبت کرنے والی گردانی جاتی ہیں۔ لیکن شیکسپیئر نے یہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ خودغرضی اور لالچ کا عفریت ساری محبتیں اور سارے رشتے ہڑپ کر جاتا ہے۔ چنانچہ King Lear طوفانی راتوں میں محل سے باہر چیخ و پکار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور پھر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ گو دونوں بدطینت بیٹیوں کا بُرا حشر ہوتا ہے اور تیسری بیٹی کے لئے ہم سراپا محبت ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس افراتفری میں المیے سے دوچار ہوتی ہے۔ یہاں کنگ لیئر پکار اٹھتا ہے، "اے ناسپاسی تو کتنی ظالم شے ہے، کتنی سنگ دل ہے" یہ چیخ اس سے بھی کہیں زیادہ دل دوز ہو جاتی ہے جب شیکسپیئر اپنے ایک اور ڈرامے "جولیئس سیزر" میں یہ دکھاتا ہے کہ کس طرح درباری، بادشاہ سیزر کے سینے میں بہتر (۷۲) خنجر پیوست کرتے ہیں لیکن سب سے مہلک خنجر اس کے اپنے انتہائی گہرے دوست بروٹس کا ہوتا ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہوتے ہیں "Even You Brutus" "تم بھی بروٹس!" ناسپاسی کے گھناؤنے عمل کی بھیانک تصویریں شیکسپیئر کے ڈراموں میں بھری پڑی ہیں لیکن زندگی کے ڈرامے میں ناسپاسی کے مظاہرے ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے Stage ہو رہے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح ایک دوست دوسرے دوست کے جذبوں سے کھیلتا ہے، کس طرح بے مہری ایک وبا کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کو ہم نے زبان دی ہوتی ہے وہ اس کی تمام فصاحت و بلاغت ہمارے ہی خلاف استعمال

کرتا ہے۔ہم نے جس کو دیوتا بنایا ہوتا ہے اس کا سارا قہر ہم پر ہی ٹوٹتا ہے۔ بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ جن بچوں کو ہم اپنا خونِ جگر دے کر پروان چڑھاتے ہیں جب وہ جواں سال ہوتے ہیں تو انہیں ایک لمحہ بھی یاد نہیں رہتا اور وہ اپنے والدین کے جذبات کا خون کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یہ صورتحال انتہائی زہرہ گداز اور دلخراش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح طور پر انسان کے بارے میں کہا ہے کہ بے شک انسان ناشکرا ہے، وہ تو اپنے خدا کی ہر نعمت جھٹلانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ جو اپنے خالق کے حوالے سے ناسپاسی کا مجرم ہوتا ہے اس سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ دور کی تمام مشکلات، تمام دکھ، ناسپاسی کے باعث پیدا ہوتے ہیں ہم ماضی کو حال سے الگ نہیں کر سکتے اور نہ حال کو مستقبل سے۔ اس لئے ہمیں اپنی تمام محبتوں اور چاہتوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا اور ہمیں اپنی ذات کے تارِ عنکبوت سے نجات پانا ہوگی، اپنی اپنی ذات سے بلند ہو کر اپنے ماحول کو سنوارنا ہوگا اور ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھنا ہوگا۔ بظاہر یہ کام بہت مشکل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں۔ دنیائے اسلام کے قرونِ اولیٰ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ مرنے والا العطش کی آواز سن کر اپنی پیاس بھول جاتا ہے اور اپنے حصے کا پانی دوسرے کو پیش کر دیتا ہے۔ بھوک سے لاچار انسان کسی حاجت مند کی آواز سنتا ہے تو اپنی بھوک بھول جاتا ہے اور ساری رات بھوکا گزار دیتا ہے مگر وہ مطمئن ہے کہ اس نے کسی حاجت مند کی حاجت پوری کی ہے۔ کسی کے کام آیا ہے، کسی کا دکھ بانٹا ہے۔ ایسا صرف حاتم طائی ہی نہیں کرتا تھا بلکہ ہر شخص حاتم طائی تھا لیکن پھر کچھ یوں ہوا کہ اعلیٰ اقدار ختم ہو گئیں اور مشینوں کی حکومت نے احساسِ مروت کو کچل دیا، رات بھر میں امیر ہونے کی خواہش نے تاجرانہ ذہنیت کو جنم دیا اور پھر تمام دنیا بازار بن گئی جس میں عصمتیں بکیں، اصولوں کا کاروبار ہوا، محبتوں کی بولی لگی اور پھر وہ خونی جنگیں لڑی گئیں جنہوں نے دنیا سے اس کا دل چھین لیا اور اسے خود غرض دماغ دے دیا، وہ دماغ جو صرف اپنے شکم کا غلام ہے اپنی حاجات کا اسیر اور اپنے

فائدے کا پجاری۔

حضراتِ گرامی! ذرا اپنی ذات سے بلند ہو کر سوچئے، کسی کے آنسو پونچھ کر دیکھئے، کسی کے غم بانٹ کر محسوس کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ عمل کتنا فرحت بخش ہے، کس قدر مسرت آفریں ہے، کس قدر نشاط انگیز ہے۔ میں نے بفضل تعالیٰ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایسے کچھ تجربات کئے ہیں اور اللہ کی رحمتیں ان پہ نازل ہوئی ہیں، میں وہ لمحے نہیں بھول سکتا جب کسی بے بصر کے والدیا والدہ افسردہ اور پژمردہ مجھے ملے اور میں نے انہیں حوصلہ دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کا بے بصر بچہ بصارت کی تمام نعمتوں سے فیض یاب ہوا۔ بے شک اس خواہش کا بدلہ خدا دینے والا ہے جو بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔

آیئے! ہم سب مل کر کسی کا دکھ بانٹنا سیکھیں، کسی کی تاریک رات کو روشن کرنا سیکھیں، کسی کی اندھیر نگری کو بقعۂ نور بنانا سیکھیں۔ دراصل یوں ہم اپنی ذات کے شب و روز کو روشن تر بنا رہے ہوں گے اور اپنی زندگی کو اجالوں سے بھر رہے ہوں گے۔ پھر یہ اُجالے ہمارے سارے ماحول کو جگمگا دیں گے۔ یہ خواہش دیوانے کی بڑ نہیں، پریشان خیالی نہیں، فصاحت و بلاغت کا اظہار نہیں بلکہ تاریخ کا سینہ اس طرزِ حیات سے جانے کتنی بار روشن ہوا ہے اور جانے کتنی بار تابناک۔

☆☆☆☆

مری منزل خدایا دُور کر دے

"مری منزل خدایا دور کر دے" میرے شعری مجموعے "سوالیہ نشان" کے پہلے شعر کا یہ دوسرا مصرع ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع ہے "مجھے ہر لحہ چلنے کا ہنر دے" ایک بار حسنِ اتفاق سے میں نے اپنی یہ غزل اپنی اہلیہ کو سنانا چاہی اور وہ سننے کے لئے تیار بھی ہو گئی، جب میں نے مندرجہ بالا شعر پڑھا تو اس نے بڑی برہمی کا اظہار کیا اور کہنے لگی "آپ بھی عجیب عجیب دعائیں کرتے ہیں" ویسے تو وہ اپنے زمانے کی پڑھی لکھی خواتین میں شامل ہے لیکن اسے کئی بار میرے اس طرح کے خیالات عجیب وغریب لگتے ہیں اور ایک اسی پر کیا موقوف کوئی بھلا مانس بھلا اپنی منزل کی دوری کی دعا کب مانگے گا۔ یہ تو علامہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے وصال پر فراق کو ترجیح دی تھی، عملی زندگی میں صورتِ حال کیا تھی یہ تو معلوم نہیں لیکن فکری سطح پر ان کے خیال میں وصل مرگِ آرزو ہے اس لئے فراق کی بات ہی الگ ہے، جس کے سحر میں کوئی فرد آگے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، اس میں قوتِ عمل باقی رہتی ہے، آرزو کے چراغ زندگی کی تیرہ وتاریک راہوں کو بھی روشن کر دیتے ہیں۔ غالب بھی کچھ اسی طرح کی صورتِ حال کو اپنے لئے قابلِ قبول سمجھتا تھا۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

زندگی میں چیلنج سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرتے ہیں اور ہمیں ہونے کا پتا دیتے ہیں، ہمیں عمل پر ابھارتے ہیں اور نت نئے امکانات وا کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم حصولِ منزل کے لئے ہی تگ ودو کرتے ہیں لیکن اگر خوب سے خوب تر کی تلاش نہ ہو تو منزل بھی بے مزہ ہو جاتی ہے اور زندگی بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلسل تحرک اور عمل کو روحِ حیات گردانا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری کی تو روحِ رواں ہی مسلسل جدوجہد ہے۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آٹھ نو سال کی عمر میں میری بینائی کا چھن جانا ایک بہت بڑا چیلنج تھا، ایک بہت بڑا سانحہ تھا اور مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے والد نے اور دیگر احباب نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور اس کے نتیجے میں بہت سے ایسے زمین وآسمان ہاتھ لگے جن کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں خوشاب کے ایسے خاموش قناعت پسند اور بڑی حد تک بے حرکت ماحول میں رہتا تھا جہاں زندگی بڑی خاموشی سے گزر جاتی ہے، پھر میرے اپنے خاندان میں بھی کوئی ایسا آئیڈیل نہ تھا جو تحرک کا جذبہ پیدا کر سکتا، چنانچہ کبھی کبھی میں اپنی اس نابینائی کو "Blessing in disguise" سمجھنے لگتا ہوں، اس میں کلام نہیں کہ میں اور میرا خاندان اس چیلنج کے ہوتے ہوئے بڑی اذیت ناک کیفیات سے دوچار ہوا لیکن اس اذیت میں بھی ایک لطف سا محسوس ہوتا دکھائی دیتا رہا۔ سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ میرا اردگرد میری زندگی پر آہ وبکا، ترحم اور اظہارِ افسوس کے سوا اور کسی جذبے کا اظہار ہی نہیں کرتا تھا، دیکھنے والوں کے نزدیک میری زندگی ختم ہو چکی تھی، کوئی روشن راہ باقی نہیں تھی، والد صاحب بھی بہت آزردہ خاطر تھے خاص طور پر جب میرے دوسرے بھائی کی بینائی بھی جاتی رہی لیکن انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ جب میرے تیسرے بھائی کی بینائی ضائع ہوئی اس وقت میں اور میرا چھوٹا بھائی علم کی روشنی حاصل کر چکے تھے بلکہ میں تو کالج میں بطور لیکچرر تعینات ہو چکا تھا۔ اس لئے تیسرے بھائی کی بینائی ضائع ہونے کے واقعہ نے والد صاحب کے اعصاب کو قائم رکھا اور وہ یہ سانحہ سہنے کے قابل ہو گئے۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ

زندگی جب کسی آزمائش میں ڈالتی ہے تو اس سے نکلنے کے اسباب بھی از خود پیدا ہونے لگتے ہیں اور میری رائے میں میرے سامنے بھی بہت سے اسباب پیدا ہوتے رہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ کئی بار ایسے واقعات ہوئے جن کے باعث میرا حوصلہ پست ہونے لگا، میں ملول ہو گیا لیکن حوصلہ شکن تجربات نے مجھ میں ہمت کا جذبہ پست نہیں کیا اور ایک وقتی پریشانی کے بعد پھر ہمت کے چراغ روشن ہونے لگے۔ چنانچہ اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ ہمت شکن حالات انسان میں تحرک بیدار کرنے کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ اشخاص جنہیں زندگی کی ہر سہولت حاصل ہوتی ہے اور جن کے سامنے مواقع ہی مواقع ہوتے ہیں وہ کسی ایک موقع سے بھی استفادہ نہیں کر پاتے بلکہ آہستہ آہستہ تمام مواقع ان سے چھنتے چلے جاتے ہیں۔ شکست کئی بار فتح کا سبب بنتی ہے تاریخ ایسی روشن مثالوں سے لبریز ہے۔

محمود غوری کو شکست ہوئی لیکن اس کی شکست نے اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔ بابر کو شکست ہوئی تو اس شکست نے اسے غیر متزلزل بنا دیا، ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اشخاص جو زندگی کے لئے مینارۂ نور بنے ہیں ان کے پاس ذرائع کی بہت کمی تھی، وسائل محدود تھے لیکن انہوں نے اپنی ہمت، مستقل مزاجی اور سعیِ پیہم کی بدولت کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے اور لافانی بن گئے چنانچہ وقتی مشکلات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جانا چاہیے، مشکلات پریشان ضرور کرتی ہیں لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو بے پناہ صلاحیتیں دی ہیں ان کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے وقتی مشکلات کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی۔ میں دنیا کی تاریخ سے ہزاروں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میری اپنی زندگی نے مجھے ایسے ثبوت فراہم کئے ہیں جن کے سامنے مشکلات کے پہاڑ رائی نظر آتے ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کوئی حیرت انگیز اور تاریخ ساز کامیابی حاصل نہیں کی لیکن یہ کیا کم ہے کہ مجھے مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا کچھ ہنر تو حاصل ہوا ہے۔ میں نے سرگودہا سے لاہور جانے کا قصد کیا میرے احباب نے کہا کہ لاہور ایک سمندر ہے جہاں قطرے کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں تھا اور شائد وہ لوگ جو نہیں جانتے

کہ میں سرگودہا واپس کیوں آ گیا ہوں ان کا یہی خیال ہو کہ میں لاہور کی وسعتوں سے گھبرا گیا تھا۔ لیکن وہ احباب جو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ یہ صورتِ حال نہیں تھی، میں گواہین کے طور پر اپنے احباب شاہد بخاری، عبدالباسط نبیل اور روحی کنجاہی کو پیش کر سکتا ہوں اور خود شعبۂ خصوصی تعلیم یونیورسٹی آف دی پنجاب کو اور اس کے صدر نشین ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کو بھی۔ میں سرگودہا سے لاہور چلا گیا تھا یہ میرا جی چاہتا تھا اور واپس اس لئے ہوا کہ مجھے لگا کہ چلو واپس چلتے ہیں، ان میں سے میرا کونسا فیصلہ غلط تھا میرے خیال میں کوئی سا بھی نہیں۔ میں چیلنجز سے نبرد آزما ہوتا رہا ہوں اور ہوتا رہوں گا، مجھے ایسا کرنا اچھا لگتا ہے اور میری رائے میں اچھا لگنا چاہیے۔ مزا اسی میں ہے کہ نت نئی صورتِ حال سے دوچار ہو کر حل تلاش کیا جائے گویا منازل کے حصول کے ساتھ ساتھ مقاصد کا حصول بھی جاری رہنا چاہیے، خود مقاصد تراشے جانے چاہئیں، چیلنج قبول کئے جانے چاہئیں بلکہ ایسی صورتِ حال پیدا کی جانی چاہیے کہ چیلنج پیدا ہوں۔ علامہ اقبال کی نظم "نالۂ ابلیس" میں ابلیس خدا سے شکوہ کناں ہے کہ جو چیلنج مجھے ملا ہے وہ تو کوئی چیلنج ہے ہی نہیں، جس کو مجھے گمراہ کرنا تھا وہ تو خود گمراہ ہونے پر تلا ہوا ہے اس لئے ابلیس چیختا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں بے کار جا رہی ہیں۔ ہماری رائے میں اقبالؒ کا ابلیس دراصل اقبالؒ کے فکر کا جزوِ لاینفک ہے اور اقبالؒ کا فکر یہ ہے کہ ہر لحظہ نئے زمین و آسماں کی تلاش جاری رہنی چاہیے اور سعی مسلسل جاری اور ساری رہنی چاہیے کیوں کہ زندگی مسلسل حرکت میں ہے۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

☆☆☆☆

شخصیّت کا سحر

سائنس نے سحر کی حقیقت کو لاکھ جھٹلا دیا ہو لیکن سحر انگیزیاں، جادو بیانیاں بدستور قائم و دائم ہیں ہر کوئی دوسرے کو مسحور کر دینا چاہتا ہے، کبھی زرق برق لباس سے، کبھی فصاحت و بلاغت سے، کبھی سیم و زر کی جگ مگ سے، کبھی دولت کی ریل پیل سے، کبھی دبدبہ اور حکمت کے اظہار سے۔ الغرض شخصیت کا جادو جگانے کی خواہش کم و بیش ہر ایک کے دل میں انگڑائیاں لیتی ہے اور جانے وہ اس کے لئے کیا کیا کچھ کر گزرنا چاہتا ہے، کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے اور کون کون سے نمود و نمائش کے ظاہری اور داخلی ذرائع استعمال کرتا ہے۔ انگریزی کے شاعر الیگزینڈر پوپ کی ایک نظم Rape of the Lock کی ہیروئن Belinda جب آئینے کے سامنے ایستادہ ہوتی ہے تو وہ حسن کی دیوی نظر آتی ہے۔ مسکراہٹوں کے تیر و تفنگ چلانے کی مشق کرتی ہے تو کبھی حسن و زیبائی کے ساز و سامان کو چہار دانگِ عالم سے اپنے سامنے ڈھیر کر کے اپنے حسن کو دوبالا کرنا چاہتی ہے۔ شیکسپیئر کا ایک کردار Polonius کہتا ہے کہ لباس ہی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اور اس کا ایک اور کردار King Lear جو شہنشاہ رہ چکا ہے اور اب زوال و ادبار کی بدترین سطح تک پہنچ چکا ہے پکار اٹھتا ہے کہ چیتھڑوں میں بڑے بڑے عیب دکھائی دیتے ہیں اور عبائیں اور قبائیں سب عیبوں کو چھپا لیتے ہیں۔

صورتحال کچھ بھی ہو شخصیت کو بنانے سنوارنے کی خواہش یوں تو فطری ہے لیکن افراط و تفریط کے باعث کوئی نرگسیت کا شکار ہو جاتا ہے تو کوئی احساسِ تفاخر میں مبتلا، کوئی احساسِ کمتری میں پھنس کر رہ جاتا ہے لیکن کوششیں جاری رہتی ہیں، حسین تر ہونے کی خواہش، عظیم تر ہونے کا جذبہ، نمایاں تر ہونے کا جنون جاری رہتا ہے اور جب یہ پورا نہیں ہوتا تو ایڈلر اور یونگ کے مطابق ذہنی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شخصیت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ لیکن شخصیت کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں؟ اس پر عام طور پر اتفاق نہیں ہو سکا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تک کوئی گفتگو نہ

کرے اس کی شخصیت کے عیب و ثواب کا پتا نہیں چلتا، کسی کا خیال ہے کہ لباس کی بڑی اہمیت ہے، ملبوسات کے ماہرین جانے کیا کیا گُر بتاتے ہیں اور فیشن کے نت نئے انداز تراشتے ہیں۔ کسی محفل میں جانا ہو تو گھنٹوں تیاری ہوتی ہے اب تو عورت پر ہی کیا موقوف، مرد بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہے، ہر شخص ایسا لباس زیبِ تن کرتا ہے جو مَیچ کرتا ہو، ہاتھ میں رومال بھی لباس کے مطابق ہو، جوتے، نکٹائی، ہیئر سٹائل الغرض ہر چیز ہم آہنگی کا اظہار کرے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ عادات و اطوار اصلیت کی غمازی کرنے پر ہمہ وقت تُلے ہوتے ہیں۔ آپ کا ایک جملہ آپ کی شخصیت کے جادو کو کافور کر سکتا ہے یا اس میں اضافہ کر سکتا ہے لیکن وہ جملہ، وہ لفظ، وجاہت آپ کے لباس کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ آپ کی ذات سے پھوٹتی ہے، آپ لاکھ سر پٹخ لیں اگر آپ کی ذات میں عظمت نہیں، آپ کی گفتگو میں وقار نہیں تو آپ کبھی کسی پر اپنی شخصیت کی دھاک نہیں بٹھا سکتے۔ دراصل میٹھے بول، اچھی بات، محبت کا اظہار، سادگی، بے ساختگی، خلوص اور سچائی ایسے گہنے ہیں جو شخصیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ہم ایسے احباب سے بھی واقف ہیں جنہوں نے نہایت سادہ لباس زیبِ تن کیا ہوتا ہے لیکن وہ اپنی پیار بھری باتوں سے محفل میں میرِ محفل دکھائی دیتے ہیں، بزم کی رونقیں ان کے دم قدم سے ہوتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ اللہ حسین ہے اور حسن کو پسند کرتا ہے لیکن یہ حسن ظاہری ہی نہیں داخلی بھی ہوتا ہے بلکہ ظاہری حسن کو داخلی حسن عزت و وقار عطا کرتا ہے، تزک و احتشام دیتا ہے، صدر جس نشست پر بھی جلوہ گر ہو صدر ہی ہوگا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ حسن جس رنگ میں بھی ہو رقیبِ سر و ساماں ہوتا ہے۔ دراصل شخصیت کے رنگ داخلی رنگ ہوتے ہیں اگر آپ کی شخصیت میں تضاد ہے، اگر آپ بظاہر بڑے شائستہ اور بھلے نظر آتے ہیں اور آپ کے اندر کا انسان ناخواندہ، اجڈ اور گنوار ہے تو آپ کا لباس اور آپ کی زیب و زینت کسی کام کی نہیں۔ ہم ایسے اصحاب کو جانتے ہیں جنہیں چاندی اور سونے میں تولا جا سکتا ہے اور تولنے کے بعد بھاری وہی ہوں گے جن کا سیم و زر ان کی تبحرِ علمی ہوتا ہے، ان کی شخصیت ان کی خوش خلقی میں مضمر ہے، ان کا خلوص دلوں کو فتح کر لیتا ہے اور ان کے میٹھے میٹھے بول اپنی عملداری قائم کر لیتے

ہیں ،دل ان کے اشاروں پر رقص کرتے ہیں اور ذہن انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ صفائی اور ستھرائی، پاکیزگی اور طہارت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن تصنع اور بناوٹ شخصیت کے دشمن ہیں۔دراصل شخصیت کے سوتے لباس سے نہیں حسنِ عمل سے پھوٹتے ہیں،سیم وزر سے نہیں علم و ہنر سے ان کا تعلق ہے،شخصیت کے بنیادی عناصر دل و دماغ میں پروان چڑھتے ہیں،اچھے لوگوں کی محفل انہیں پروان چڑھاتی ہے،اچھے اصول اچھے آدرش ان کی آبیاری کرتے ہیں،شخصیت کی تعمیر سماج کی بھلائی میں مضمر ہے،خدا کے احکام کی تکمیل میں پوشیدہ ہے اور انسانی بھلائی اس کا جزولاینفک ہے۔مکاری دروغ گوئی اور بدخوئی شخصیت کے لئے سمِ قاتل ہیں۔

اپنی زبان سے دوسروں کے دل جیتئے،اپنے عمل سے روشنی پھیلایئے ،اپنے کام سے نام کمایئے اور اپنے داخلی حسن سے ظاہری حسن کو دوبالا کیجئے۔

☆☆☆☆

حقوق و فرائض میں رسہ کشی

یوں تو ابتدائے آفرینش سے حقوق و فرائض کے حوالے سے بے اعتدالیاں ہوتی رہی ہیں۔حضرتِ آدمؑ تمام حقوق حاصل کرنے کے باوجود صرف ایک فرض ادا کرنے میں لغزش کا شکار ہو گئے۔یہ الگ بات کہ بعد میں انہیں اس کا احساس ہو گیا اور اللہ نے اس احساس ہی کو کافی جانا ،بعد ازاں اقوام و ملل ہمیشہ حقوق و فرائض کی بات کرتی رہی ہیں لیکن کچھ ایسا لگتا ہے کہ جبلّی طور پر انسان اپنے حقوق کی زیادہ بات کرتا ہے اور فرائض کی کم، کیونکہ حقوق کا تعلق اپنے فائدے سے ہوتا ہے اور فرائض کا تعلق دیگر اشخاص کے فائدے سے۔بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے حقوق کی پاسداری کرنے لگتا ہے،ذرا ماں سے کوتاہی ہوئی تو چیخنے چلانے لگا،کسی نے توجہ نہ دی تو برہمی کا اظہار کیا۔اس صورت حال میں اگر اسے فرائض کا احساس نہ ہو تو فرق نہیں پڑتا کیونکہ بچہ تو فطرت کے بعض تقاضوں کے مطابق عمل کر رہا ہوتا ہے لیکن بعد ازاں فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے سماجی شعور کا پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔اگر بچے کی طرح کوئی بڑا صرف اپنے حقوق کی بات کرتا رہے،اپنی ضروریات کا ڈھنڈورا پیٹتا رہے اور اپنا ہی گھر بھرتا رہے تو اسے خودغرضی اور تنگ نظری کہا جائے گا، کیونکہ فطرت نے جو کچھ عطا کیا ہے اس کی مساوی تقسیم ہی سے معاشرتی ضروریات کی تکمیل ممکن ہے۔اس لئے اگر حرص و طمع سب کچھ سمیٹنے پر تلی رہے تو معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا اور طاقت کا بول بالا ہو گا۔کوئی انتہائی غریب اور بے دست و پا ہو گا تو کوئی انتہائی متمول اور خوشحال۔لیکن تہذیب و شائستگی نے یہ باور کروایا کہ حقوق کے ساتھ ساتھ فرائض کی ادائیگی سے ہی معاشرے کی بقاء ممکن ہے۔قرآنِ کریم نے انسانی مساوات پر زور دیا ہے اور کم و بیش ہر مذہب نے اپنے اپنے انداز میں معاشرتی زندگی کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔تمام ادارے حکومتیں اور ریاستیں بظاہر اسی مقصد کے حصول کے لئے قائم کی گئیں ہیں۔لیکن کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فرد نے ہمیشہ اپنی ذات ہی کو مرکز و محور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔تعلیم نے یقیناً اس میں روشن

خیالی، رواداری اور انسانی ہمدردی پیدا کی ہے لیکن مجموعی طور پر ہمیں ہر فرد، ہر معاشرہ اور ہر تہذیب پیٹ پوجا میں منہمک نظر آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ یونانیوں نے سٹی سٹیٹ قائم کر کے حقوق و فرائض کا ایک خاکہ پیش کیا تھا، پھر خطبۂ حجۃ الوداع میں رسولِ کریمؐ نے انسانی برادری کی فوز و فلاح کے لئے سنہری اصول پیش کئے۔ میگنا کارٹا کے اعلامیہ میں انگلستان میں حقوق و فرائض کی کچھ بات ہوئی اور پھر قوموں کے مختلف آئین سامنے آئے۔ مجلس اقوامِ متحدہ نے انسانی حقوق کی شدومد سے وکالت کی، مجموعی طور پر ہمارے معاشرے اور افراد صرف حقوق کی بات کرتے رہے ہیں تاہم فرائض کی انجام دہی کی بات بہت کم ہوئی ہے۔ حقوق اللہ کے سلسلے میں یقیناً کچھ کام ہوا ہے مثلاً بہت سے ایسے افراد ہیں اور بہت سی تنظیمیں بھی ہیں جو حقوق اللہ کی ادائیگی پر بظاہر بہت زور دیتی ہیں، وطنِ عزیز میں بہت سی جماعتیں گھر گھر جا کر حقوق اللہ کی بات کرتی ہیں، مسجدوں میں بھی اقامِ وصلواۃ اور دیگر مذہبی فرائض کی ادائیگی کا ذکر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکواۃ دینے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور حج کی سعادت بھی حاصل کرتے ہیں۔

ہماری رائے میں ان تمام کوششوں کے مثبت نتائج برآمد ہونے چاہئیں۔ ایک نمازی دن میں بار بار یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا، صحیح راستے پر چلے گا اور اللہ کے بندوں کی فوز و فلاح کے لئے کام کرے گا۔ اسلام کی تمام عبادات رزقِ حلال، سعی و کاوش، سچ، دیانت داری اور دیگر اعلیٰ انسانی اقدار پر زور دیتی ہیں لیکن عملی طور پر صورتِ حال دگرگوں نظر آتی ہے۔ ہماری موجودہ پریشانیاں ختم ہو سکتی ہیں اگر ہم اللہ کا خوف دل میں پیدا کر لیں اور اس کے بندوں سے پیار کرنے لگیں۔ ایسی تنظیمیں اور ادارے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے جو گھر گھر جا کر یہ کہتے ہوں کہ کم مت تولنا، جھوٹ مت بولنا، ذخیرہ اندوزی سے اجتناب کرنا، کسی کا حق مت مارنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رزقِ حلال کمانا اور یہ بھی کہ حرام کا ایک لقمہ ساری عبادات کو ضائع کر دیتا ہے، ایسے شخص کی چالیس روز دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ کتنی تنظیمیں ہیں جو وقت کی پابندی پر زور

دیتی ہیں، صفائی ستھرائی پر کتنے رضا کارانہ ادارے کام کر رہے ہیں۔ ہر پیشے کی ایک تنظیم ہے جو صرف اس کے حقوق کی بات کرتی ہے فرائض کی نہیں۔ اگر دودھ فروشوں کی تنظیم ہے تو اس کے منشور میں یہ شامل نہیں کہ دودھ میں پانی ملانے والا مجرم ہے اور ایسے شخص کو تنظیم سے خارج کر دیا جائے گا، ڈاکٹرز کی تنظیم اپنے حقوق کی بات کرتی ہے، مگر ان کے منشور میں یہ شامل نہیں کہ مریضوں کا استحصال کرنے والے اطبا سزا کے مستحق ہوں گے، اساتذہ اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں مگر ایسا کم ہی ہوا ہوگا کہ انہوں نے ایسے احباب کا مواخذہ کیا ہو جو پڑھانے سے ہمیشہ جی چراتے ہیں اور مختلف مواقع پر فحش غلطیاں کرتے ہیں۔ دوکانداروں کی اپنی تنظیم، قصابوں کی اپنی۔ لیکن سب کو اپنے حقوق کی فکر ہے فرائض کی نہیں۔ اس تمام صورت حال میں یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ حقوق کا حصول فرائض کی ادائیگی کے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ ایک فرد کا حق دوسرے کا فرض ہے اگر کوئی ملاوٹ کرے گا تو دوسرا رشوت میں ملوث ہوگا، اگر کوئی کم تولے گا تو دوسرا دو نمبر اشیاء فروخت کرے گا، اگر ڈاکٹر تسلی بخش علاج نہیں کرے گا تو اساتذہ کبھی دل سے نہیں پڑھائیں گے۔ گویا ایک بیماری دوسری بیماری کو جنم دیتی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کے محلے میں عفونت ہو اور آپ کا اپنا گھر خواہ وہ صاف ستھرا بھی ہو اور بیماریوں سے محفوظ رہے۔ اگر آپ کسی کا حق ادا نہیں کرتے تو کوئی آپ کا حق ادا نہیں کرے گا۔ ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم ہے جو اپنے فرائض کو اس لئے ادا کرتے ہیں کہ وہ فرائض کی ادائیگی ضروری جانتے ہیں، ان میں خوف خدا ہے اور ان کا ضمیر زندہ ہے۔ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ اس انتہائی افسوسناک صورتحال میں رہتے ہوئے فرائض ادا کرنا بھی چنداں آسان نہیں۔ بسا اوقات فرائض کی ادائیگی بڑی مہنگی پڑتی ہے ایسا شخص یکہ و تنہا رہ جاتا ہے بلکہ اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اپنا کاروبار ہی تباہ کر بیٹھتا ہے۔ لیکن پھر بھی ابھی" کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جو سود و زیاں کی پرواہ کئے بغیر اپنے آپ زندگی گزار رہے ہیں اور جوں جوں ایسے روشن چراغوں کی تعداد بڑھتی رہے گی، زندگی کے اندھیرے کافور ہوتے رہیں گے۔

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ان کی کہانی بہت دلچسپ تھی، جانے کتنے گوش بر آواز تھے۔ ہر کوئی سراپا سماعت تھا" پھر کیا ہوا" کسی نے کہا" آگے چلئے نا! رک کیوں گئے ہیں" ایک اور طرف سے آواز آئی " شائد انہیں نیند آ گئی ہے، شاید وہ سو گئے ہیں" کسی ایک نے کہا، ہاں! انہیں نیند آ گئی تھی، وہ سو گئے تھے، پھر موت ماندگی کے وقفے کے سوا اور ہے ہی کیا، یہ ایک قدرے طویل نیند ہے، اسی نیند نے چند روز پہلے پروفیسر چوہدری عبدالحمید کو آلیا تھا اور کچھ ہفتے قبل اسی نیند نے صوفی فقیر محمد کے درِ چشم پر دستک دی تھی اور جانے کہاں کہاں دستکیں ہوئی تھیں لیکن ہمیں یہ دو دستکیں کچھ زیادہ ہی سنائی دیں، ان شخصیات کے ساتھ اک گہرا تعلق تھا، بہت ہی قربت کا تعلق۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ پروفیسر عبدالحمید ریاضی کے پروفیسر تھے، گورنمنٹ کالج سرگودھا میں برس ہا برس ریاضی پڑھاتے رہے اور ریاضی کے علاوہ اس مادرِ علمی کی مشاطگی میں ہمہ وقت محوِ کار رہے، کبھی انتظامی امور میں، کبھی تعلیمی مشاغل میں، کبھی اصلاحی سرگرمیوں میں اور کبھی دینی و روحانی امور میں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ وہ اسی درسگاہ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل رہے، ناظمِ تعلیم (سرگودھا) بن گئے اور یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور کے انتظامی معاملات میں بھرپور کردار ادا کرتے رہے، صفہ کے نام سے درس گاہیں قائم کیں۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ کتنی عظیم شخصیت تھے، کتنے پیارے انسان، کتنے بلند قامت مفکر اور کتنے خوش طبع اور انسان دوست، اندر سے کتنے توانا اور بھرپور تھے، جس قدر میں انہیں جان سکا ہوں وہ یقیناً ان کی شخصیت کا عشرِ عشیر ہوگا لیکن جس قدر میں جانتا ہوں وہ میرے لئے بڑی تقویت کا باعث ہے اور یہ مجھے ان کی شخصیت سے دائمی پیار کے لئے کافی ہے اور ہمیشہ کے لئے تحریک دینے کے لئے بھی بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے اپنی زبانی اپنی کہانی بہت کم کہی لیکن مجھے ان کی علم دوستی اور انسان پروری کی سینکڑوں کہانیاں معلوم ہوتی رہیں، کوئی اور نہیں سناتا رہا بلکہ وہ سناتے رہے جو ان کی ان کہانیوں

کے کردار تھے، جو ڈاکٹر بنے، وکیل بنے، اچھے انسان بنے، اچھے محبِ وطن بنے اور راسخ العقیدہ مسلمان بنے، انہوں نے راہِ علم کے مسافروں کو کبھی تنہا نہ رہنے دیا، ان کی دامے، درمے، سخنے، قدمے بڑی حد تک مدد کی۔ ٹیلنٹ پول کی کہانی بہت سے جانتے ہیں لیکن ٹیلنٹ پول کے عرض و بلد سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ چوہدری صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے، وہ میرے رفیقِ کار بھی رہے، پرنسپل بھی، اعلیٰ افسر بھی لیکن وہ ہمیشہ میرے دوست رہے، میرے بہت قریب رہے، اتنے قریب کہ جتنا اس دوڑتی بھاگتی دنیا میں کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ جن مراتب پر وہ فائز رہے ان مراتب پر فائز رہنے والے بہت کم لوگ ہیں جو میرے اور میری سرگرمیوں کے بارے میں وہ کچھ کہتے تھے جو ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ میرے کام اور میری مساعی کی دل سے قدر کرتے تھے اور یہ امر میرے لئے بڑے حوصلے کا باعث رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں لوگوں کو اپنی بے پناہ تعریف کرتے ہوئے سنا ہے، ان کی تحریریں پڑھی ہیں لیکن ایسے حضرات بہت ہی کم ہیں جن کے بیانات اور تحریروں نے مجھے سچ مچ حوصلہ دیا، ان میں سے ایک یقیناً چوہدری عبدالحمید تھے۔

جب کوئی بچھڑ جاتا ہے یا چلا جاتا ہے تو ایسے مواقع پر لفظ دم توڑ دیتے ہیں۔ بالخصوص مجھے یونہی محسوس ہوتا ہے۔ انہی دنوں میرے ایک اور مہربان جدا ہو گئے جن کا ذکر میں نے شروع میں کیا، یہ تھے صوفی فقیر محمد صاحب۔ چوہدری حمید صاحب نے صفہ سکول اور کالج قائم کئے اور صوفی صاحب صوفی تھے۔ ان دونوں حضرات میں ایک قدر تو یہ مشترک تھی کہ دونوں ادب و شعر سے محبت کرتے تھے، حمید صاحب اچھے شعر کے سحر میں گرفتار ہو جاتے تھے، صوفی فقیر صاحب خود شاعر تھے اور اگر انہیں ساحر گر کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا، میں نے ان کی زندگی میں اس بات کا کئی بار اعتراف کیا، سٹیج پر اس کا اظہار بھی کیا کہ "ساحلِ تشنہ لب" کی تخلیق کے دنوں میں صوفی فقیر محمد صاحب میری بھرپور رہنمائی کرتے تھے اور بہت سے معاملات میں ہدایات دیتے رہے۔ میری ادبی زندگی کی پہلی بھرپور تقریب میرے گھر 736 / A سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا میں

31 اکتوبر 1980 کو منعقد ہوئی۔اس کا سارا انتظام و انصرام صوفی صاحب نے کیا۔انہوں نے ہی تقریب کی کمپیئرنگ کی اور یوں سرگودہا کے کم و بیش تمام شعراء کو مجھ سے متعارف کرایا اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔عروض کے معاملہ میں میں جن دو احباب سے بہت متاثر ہوں ان میں ایک صوفی صاحب اور دوسرے برادرِ محترم جناب روحی کنجاہی صاحب ہیں، جو کام سرگودہا میں صوفی صاحب سرانجام دیتے رہے اور جس طرح سرگودہا کی علمی و ادبی شخصیات سے مجھے متعارف کراتے رہے اسی طرح لاہور میں روحی کنجاہی صاحب نے مجھے کم و بیش لاہور کے پچاس سالہ علمی و ادبی پس منظر سے آگاہ کیا اور کرتے رہتے ہیں۔صوفی صاحب شاعر ہوتے ہوئے حیرت انگیز حد تک مخلص تھے اور ان کی زبان بڑی حد تک ان کے دل کی رفیق تھی۔چوہدری حمید صاحب کے مقابلے میں صوفی صاحب کو وہ سہولتیں میسر نہ تھیں جو ان کے پیغام اور کلام کی ترسیل میں ممد و معاون ثابت ہوتیں لیکن ان کا حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا۔

انہوں نے جانے کتنے احباب کی میدانِ شعر و ادب میں رہنمائی کی لیکن بہت کم لوگوں نے اس کا اعتراف کیا کیونکہ اس طرح کے اعترافات شاعروں اور ادیبوں کے لئے ہمیشہ ایک بہت بڑا چیلنج رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان دونوں احباب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کے حوالے سے اپنا حق دیانتداری کے ساتھ ادا کر سکیں۔آمین۔

☆☆☆☆

پھول اور کلیاں

پھول اور کلیوں کے الفاظ لبوں پر آتے ہی موسمِ گل ذہنوں میں نمودار ہو جاتا ہے، تازہ ہوائیں چلنے لگتی ہیں، فضا مخمور ہو جاتی ہے، اسی طرح سب گھروں میں پھول کھلتے ہیں تو فضا ہی بدل جاتی ہے ماحول ہی تبدیل ہو جاتا ہے اور اگر یہ پھول اور کلیاں بچوں کی صورت میں ہوں تو کیا کہنے، انہی سے تو آنکھوں میں نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے، انہی سے زندگی میں چہل پہل اور رنگا رنگی ہوتی ہے، کسی نے کہا تھا کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ابھی خدا انسانوں سے مایوس نہیں ہوا اور جس گھر میں بچہ جنم لیتا ہے ایسا لگتا ہے کہ مستقبل کی خوشیاں اور رعنائیاں اس گھر کا مقدر رہوں گی۔یہ الگ بات کہ ہمارے میڈیا نے اور اشتہارات نے کچھ ایسی فضا قائم کر دی ہے کہ اگر دو تین بچوں کے بعد کوئی اور بچہ ہو گیا تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔اس میں کلام نہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی ہمارا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر افرادی قوت صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو تو زندگی نت نئے رخ اختیار کر لیتی ہے پھلتی پھولتی ہے۔

مسئلہ تعلیم و تربیت اور پرداخت کا ہے ہم تیسری دنیا کے باسی اقتصادی بحران کا شکار ہیں اور کیونکہ دولت کی کچھ ایسی غیر مساوی تقسیم ہوئی ہے کہ ہمارے حصے میں جو ٹھے لقمے ہی رہ گئے ہیں، تر نوالے بلکہ نوالوں پر نوالے تو طاقت اور استحصال کے ہاتھ لگے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ہم نہتے کیوں رہ گئے؟ طاقت ہم سے کیوں چھن گئی؟ ہم کمزور سے کمزور تر کیوں ہو گئے اور وہ طاقت ور سے طاقتور ترین کیوں ہو گئے؟ اس گفتگو کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ اس تصور ہی سے پھول اور کلیوں کا تصور پھیکا پڑ جاتا ہے۔

ہماری رائے میں انسانی بچوں کی پرورش سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔کتنی مخلوق ہے جس کے بچے پلتے چلے جاتے ہیں لیکن یہ پلنا جسمانی ہوتا ہے، انسان کے بچے کی پرورش جسمانی بھی ہوتی ہے، ذہنی بھی، نفسیاتی بھی اور اخلاقی بھی اس لئے یہ خاصا مشکل کام ہے۔یہ کوئی میکانکی

عمل نہیں کہ بچہ پیدا ہوا، ماں نے دودھ پلایا بعد میں جو کچھ ملا دے دیا، دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہو گئے، ہاں کہیں کہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

لیکن اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہوتا، ہم جانتے ہیں کہ بچے کی جسمانی اور ذہنی نشوونما شکم مادر سے شروع ہو جاتی ہے، کتنوں کو یہ معلوم ہے کہ ہونے والی ماں کو کس قدر ذہنی اور جسمانی آسودگی درکار ہے، کتنوں کو علم ہے کہ اس عرصہ میں ماں ہی نہیں بلکہ اس کے ہونے والے بچے کی صحت بھی غلط طرزِ عمل سے خطرات کا شکار ہو سکتی ہے، چلیئے بچہ پیدا ہو گیا، بچی ہوئی تو قبول کر لی گئی، بچہ پیدا ہوا تو زیادہ خوشی کا اظہار کیا گیا، مٹھائیاں تقسیم ہوئیں، ہر ایک نے مبارکباد دی، رسمی کارروائی ختم ہوئی، لیکن دراصل ذمہ داری اور دیکھ بھال کا عمل تو یہیں سے شروع ہوتا ہے، ماں باپ بسا اوقات یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کو کسی چیز کا کیا علم۔ وہ لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، کئی بار صورتحال بڑی گھمبیر ہو جاتی ہے کہ معصوم بچہ صورتحال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ وہی زبان سیکھتا ہے جو والدین استعمال کرتے ہیں، وہی اشارے اور کنائے اختیار کرتا ہے جو والدین کے روزمرہ کا حصہ ہوتے ہیں، وہ وہی عادات سیکھ رہا ہوتا ہے جو والدین کی ہیں لیکن والدین کا خیال یہ ہوتا ہے کہ چلیئے جو ہم نہیں کر سکے وہ ہمارے بچے کر لیں گے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ جو نہیں کر سکے اس کی سزا میں اُن کے بچے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ بائبل کا یہ قول کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ماں باپ نے کھٹے انگور چکھے اس لئے ہمارے دانت کھٹے ہیں۔ لیکن بچوں کے حوالے سے یہ بات بالکل سمجھ میں آنے لگتی ہے جینیٹکس کے علم نے تو اس حقیقت کو اور بھی واشگاف کر دیا ہے۔ جینیٹکس کے جبر کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں لیکن ماہرینِ حیاتیات، عمرانیات اور نفسیات متفق ہیں کہ جینیاتی اثر و نفوذ کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی اثرات بڑے اہم ہوتے ہیں، چلئے ہم جینیٹکس کے جبر کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے لیکن ایسا تو ممکن ہے کہ ہم ایسا ماحول پیدا کر لیں جس میں بچے آزاد انداز سے پھل پھول سکیں، انہیں ایسی فضا مہیا کی جائے کہ یہ پھول اور کلیاں مسکرا سکیں اور ارتقاء

کے عمل سے گزر سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ والدین بچے کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کریں اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کریں اور اس کا نفسیاتی مطالعہ جاری رکھیں۔ اگر وہ اپنے ماحول میں دلچسپی نہیں لیتا تو اس کے اسباب جاننے کی کوشش کریں، اگر اس کے تاثرات فطری نہیں تو اور گہرائی سے اس کی شخصیت کا مطالعہ کریں، اسے پیار کریں، سینے سے لگائیں، تھپکیاں دیں اور حوصلہ افزائی کریں کسی طور بھی اس کے تخلیقی عمل کو مسدود نہ کریں۔

یہاں ایک انتہائی اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک بچے کو اس کے اعمال میں آزاد چھوڑا جائے اور کہاں تک اس پر پابندی عائد کی جائے یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور اس ضمن میں کوئی بندھے ٹکے اصول کارآمد نہیں ہو سکتے۔ آپ کسی بچے کی بنے بنائے اصولوں کے مطابق پرداخت نہیں کر سکتے، انہیں آپ ایک بار پیار سے سمجھائیں تو وہ سمجھ جاتے ہیں کئی بچے بار بار سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتے، کئی بچے سختی کرنے سے باغی ہو جاتے ہیں اور کئی بچے راہِ راست پر بھی آجاتے ہیں۔ بچوں کی پرداخت میں نرمی اور سختی کتنی ہو اس کا فیصلہ والدین کو حالات کے مطابق خود کرنا ہو گا، اس میں اساتذہ، ماہرینِ نفسیات و عمرانیات اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ والدین بچے کے دل میں پیدا ہونے والے سوالات کا تشفی بخش جواب دیں اور اس کی توڑ پھوڑ کی سرگرمیوں کو پیار اور محبت سے منضبط کرنے کی کوشش کریں۔ توڑ پھوڑ کے مشاغل دراصل بچے کے دل میں تجسس کے غماز ہیں یا پھر اس کی اندرونی توانائی کے استعمال کا مظاہرہ ہیں، وہ بچہ جس کے پاس مثبت مشاغل نہیں تو یقیناً وہ منفی مشاغل میں منہمک ہو جائے گا۔ ایسے میں اس کے والدین اس کی نفسیات سے واقف نہیں تو وہ مار پیٹ کا سہارا لیں گے اور اس طرح بچہ بغاوت پر اتر آئے گا یا پھر ہتھیار ڈال دے گا۔ دونوں صورتوں میں اس کی شخصیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ جی بی شا نے اپنے ڈرامے Devils's Disciple میں ایک ماں کا کردار پیش کیا ہے، وہ بہت سخت گیر ہے وہ اپنے بچوں کے لئے خود فیصلے کرتی ہے۔ وہ کبھی معاف کر دینے کیلئے تیار نہیں، نتیجتاً ایک بچہ باغی ہو جاتا ہے وہ مذہبی عقائد کو بھی خیرباد کہہ دیتا ہے اور سماجی مسلمات کو بھی۔ مگر دوسرا بچہ

ماں کے جبر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور اسکی ذہنی نشوونما رک کر رہ جاتی ہے۔ نتیجتاً اکیس سال کا ہو کر بھی وہ کھلونوں سے کھیل رہا ہوتا ہے اور اس کی ذہنی عمر تین چار سال کی ہوتی ہے۔ اس صورتحال سے دوچار بچے Autism کا شکار ہو جاتے ہیں ان کی خود سوچنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ سرے سے بعض اوقات وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان کے چہرے خالی خالی، ان کی آنکھیں بے بسی کا شکار، جو وہ چاہتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں وہ کرنے کے لئے تیار نہیں، کونے کھدروں میں چھپے چھپے بلی کے بچوں کی طرح دبکے دبکے اور خائف نظر آتے ہیں۔ کبھی اس انداز سے ہنستے ہیں کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں نہ وہ کسی سمت دیکھتے ہیں اور نہ ان کی سماعتیں تیز ترار ہوتی ہیں، ان کے ذہنی اور جسمانی عوامل میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ صورتِ حال نہ بھی ہو تو کئی بچے اور بہت سے ذہنی عارضوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دولے شاہ کی چوہی نظر آتے ہیں یا پھر یار لوگ انہیں آسیب زدہ قرار دے دیتے ہیں کبھی کسی پیر کے پاس، کبھی کسی فقیر کے پاس والدین سرگرداں، پریشان اور نڈھال نظر آتے ہیں۔ ایسے بچے شیزوفرینک بھی ہو جاتے ہیں وہ دو دنیاؤں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک داخلی دنیا اور دوسری خارجی دنیا، ایک آواز آتی ہے "سنو گاڈ" اور دوسری آواز انہیں خارجی ماحول سے سنائی دیتی ہے، کسی ماں کی چیخ، کسی باپ کی آہ، کسی بزرگ کی دعا۔ ان میں سے بہت سے بچے اپنا تعلیمی سفر جاری ہی نہیں رکھ سکتے، ایسے بچوں کو ہم تعلیمی معذور سمجھتے ہیں اگر ان کا عارضہ شدید نہ ہو تو وہ جماعتوں میں Back Benchers ہو جاتے ہیں اور معاشرے میں پسماندہ۔ ذہنی طور پر پسماندہ بچے کسی جسمانی حادثے کی وجہ سے بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس کی وجہ ماحولیاتی بھی ہوتی ہے، یہاں ہم ماحولیاتی پہلو کو ہی زیرِ بحث لا رہے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بلاشبہ صورتِ حال بڑی بھیانک ہے، بڑی المناک، لیکن والدین کیا کریں، وہ والدین جو صبح سے شام تک روٹی کے دھندے میں لگے ہوتے ہیں، وہ والدین جنہیں سماجی مشاغل سے فرصت نہیں، وہ والدین جو بڑے بڑے سیاست کار، دانشور اور

مدبر ہیں، اخبارات ان کے کالموں سے بھرے پڑے ہیں، کسی تنظیم کے وہ صدر ہیں، کسی کے جنرل سیکرٹری، مائیں انسانی حقوق کی تنظیموں کی عہدیدار ہیں سماجی تنظیموں میں پیش پیش ہیں، دنیا کے بچوں کی خستہ حالی دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہیں۔ یہ مائیں، یہ باپ، اپنے بچوں کے آنسو کیسے پونچھیں؟ ان سے کیسے ملیں؟ ان کے دکھ کیسے بانٹیں؟ کیسے جانیں کہ وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں، انہیں کیسے معلوم ہو کہ ان کی زندگی میں کوئی ہیجان، کوئی بحران، کوئی الجھن در آئی ہے، انہیں کیسے معلوم ہو کہ ان کے آنگن میں جوانی در آئی ہے۔ انہیں کوئی رفیقِ سفر چاہیے، انہیں کوئی ساتھی چاہیے، ان کے پاس وقت ہی نہیں کہ جان سکیں کہ سکول میں ان کی پوزیشن بد سے بدتر کیوں ہو رہی ہے۔

یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ کچھ والدین تو جان ہی نہیں سکتے کہ بچے کی کوئی نفسیاتی دنیا بھی ہوتی ہے اور جو جان سکتے ہیں ان کے پاس وقت ہی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کی جذباتی دنیا میں داخل ہو کر انہیں پریشان ہونے سے بچائیں۔ انہیں کچھ خوشیاں فراہم کر دیں اور ان کی زندگی کو مثبت راہوں پر ڈال دیں۔ ہماری رائے میں یہ انتہائی نازک مسئلہ ہے، شائد دہشت گردی، فرقہ پرستی اور انتہا پسندی سے بھی کہیں زیادہ بڑا مسئلہ بلکہ اگر کہا جائے کہ یہ تمام مسائل گھر ہی سے جنم لیتے ہیں تو شائد غلط نہ ہوگا۔

☆☆☆☆

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں

خلقِ خدا کے لبوں پر کبھی شکوہ و شکایت ہوتا ہے اور کبھی تشکر کے الفاظ، کبھی انسان مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو کبھی وہ رجائیت سے ہمکنار ہوتا ہے، امید و بیم کا یہ تماشا دراصل زندگی کا تماشا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے زندگی کی تمام خوشیاں نصیب ہو جائیں اور ہر روز روزِ عید ہو اور شب، شبِ برات، وہ زندگی کی تمام تر خوشیاں، رعنائیاں اور دل فریبیاں، اپنا حصہ سمجھتا ہے اور جب مشکلات آن پڑتی ہیں تو وہ چیخ اٹھتا ہے، چلانے لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی دھوپ چھاؤں کا نام ہے، یقیناً ہم زندگی کی چھاؤں کو طویل کر سکتے ہیں، سایوں کو بڑھا سکتے ہیں لیکن بسا اوقات حل من مزید کا آسیب ہمارا تعاقب کرنے لگتا ہے اور ہم لالچ کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں، دوسروں کے حصوں کی خوشیاں بھی خود سمیٹ لینا چاہتے ہیں، بس یہاں سے زندگی کی دھوپ جھلسانے لگتی ہے جھلسا کر رکھ دیتی ہے، راکھ راکھ کر دیتی ہے، اللہ نے تو جانے کیا کیا نعمتیں عطا کی ہیں اور برملا کہہ دیا ہے کہ "تم کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے" لیکن خود خلقِ خدا نے خلقِ خدا پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔

انسان آپ اپنی تباہی کو کم نہیں
دنیا کی اس تباہی کو کارِ اجل نہ لکھ

اور کبھی انسان کہہ اٹھتا ہے۔

آدمی ہے کہیں نہ آدم زاد
آدمی آدمی کو چاٹ گیا

دراصل آدمی ہی آدمی کا بہترین دوست اور بدترین دشمن ثابت ہوا ہے۔ مذہبی تعلیمات کے شارحین نے خدا کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا ہے اور کچھ یوں ثابت کیا ہے کہ وہ جیسا ان سے کہیں دور ہے اور انسان اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے جانے کیا کیا حیلے بہانے تلاش

کرتا ہے، کون کون سے لات و منات تراشتا ہے، کبھی کسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے تو کبھی کسی آستاں پر سر جھکاتا ہے، حالانکہ وہ ذاتِ برحق تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ جب کوئی اسے پکارتا ہے تو وہ اسے سنتا ہے، بلکہ اسے پکارنے سے پہلے ہی علم ہوتا ہے لیکن زمینی مصلحتوں نے خدا سے ان کا رابطہ ہی منقطع کر دیا ہے کہ ان کی اپنی جھولیاں بھرتی رہیں اپنی دکان جمی رہے۔

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

حقیقت یہ ہے کہ ذاتی منفعتوں نے کائناتی منفعتوں کو نگل لیا ہے اور اس تعلیم کو عام ہونے نہیں دیا کہ اصل عبادت تو خلقِ خدا کے دکھوں کو بانٹنا ہے اس کے آنسوؤں کو پونچھنا ہے، اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، قرآنِ کریم کی تمام تعلیمات اسی نقطے کے گرد گھومتی ہیں اور نبی آخرالزماں کی پوری زندگی خلقِ خدا کی بھلائی کے لئے وقف ہے، جس میں کسی عقیدے، کسی کیش، کسی جگہ اور کسی مقام کی پابندی نہیں اور یہ وہ تعلیمات ہیں جن کے مطابق پوری انسانیت ایک کنبے کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دور کی تمام مشکلات اور محرومیاں بڑی حد تک ہماری اپنی خود غرضیوں اور منفعت پسندیوں کی وجہ سے ہیں۔ آج بڑی طاقتیں تمام دنیا کو زیرِ نگیں کر لینا چاہتی ہیں ایک مذہب تمام مذاہب کو نگل جانا چاہتا ہے، ایک فلسفہ تمام فلسفوں کو باطل قرار دیتا ہے۔ زندگی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کو پنپنے ہی نہیں دیا جاتا ہے، دراصل دنیا تو وہ باغ ہے جس میں ہر طرح کے پھول کھلے ہیں اور جہاں کانٹے بھی موجود ہیں جہاں لطافتیں بھی ہیں اور کثافتیں بھی۔

گلشن پرست ہوں، مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یہ گلشن پرستی ہی زندگی کی اساس ہے اور خوشیوں کی ضامن، یہ گلشن پرستی وسیع المشربی،

اعتدال اور روشن خیالی کو جنم دیتی ہے اور یہی گلشن پرستی ہر عقیدے، ہر فلسفے اور ہر مذہب کے تحفظ کی ضامن ہے۔ لیکن تمام تر تعلیم اور تجربے کے باجود انسان نے بہت کم سیکھا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے اب بھی ہم ایک جنگل میں بس رہے ہوں جہاں لاقانونیت کا دور دورہ ہو اور شیر اس لئے شہنشاہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

ان کا جنگل تھا اور ان کا قانون تھا

جس طرح جی میں آیا بدلتے رہے

دراصل یہ قانون کسی ایک فردِ واحد کا نہیں ہونا چاہیے، کسی ایک طاقتور کا حق نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ قانون زندگی کی کوکھ سے ابھرنا چاہیے، یہ وہی قانون ہے جس کے نفاذ کے لئے تمام تہذیبیں اور تمام مذاہب کوشاں رہے ہیں لیکن اس کے باوجود انسان کی خودغرضیاں بڑھتی ہی چلی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آشوب کے باوجود اب بھی روشنی کی کرنیں کہیں کہیں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ اب بھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جن کو مل کر دل خوش ہوتا ہے، ایسے ادارے ہیں جو زندگی کی بقاء کے لئے کام کر رہے ہیں اور ایسی تعلیمات موجود ہیں جن پر عمل کر کے زندگی کو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے۔ بڑی حد تک صورتِ حال ایسی ہے جس میں زندگی کو آگے بڑھانے، خوبصورت بنانے اور خوشحالی کے اسالیب موجود ہیں۔ ہسپتال تعلیمی ادارے خانقاہیں اور بہت سی فلاحی تنظیمیں اب بھی کوشاں ہیں، اب بھی سسکتی انسانیت کو بچانا چاہتی ہیں قرآن کتاب زندہ کے طور پر ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی عقل کو استعمال کرنا سیکھ لیں اور اپنے وجدان سے روشنی تلاش کرنا سیکھ لیں۔ لیکن اب بھی مشکلات حائل ہیں ہمارے خیال میں اب بھی دنیا کی اسی فیصد آبادی علم و آگہی سے عاری ہے تشریحات قبول کرتی ہے نہ خود تشریحات کرنے کے قائل ہیں، اسے بنے بنائے اور گھڑے گھڑائے فیصلے منظور ہیں۔ اب بھی خوداعتمادی اور خودشناسی کے چراغ گل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم کو نئے کیسرا ترجیح سے زیادہ اہم تصور کیا جائے لیکن ایسا کرنے میں مسند نشینوں کو خطرات لاحق ہوجاتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ

غالب طاقتیں مغلوب قوموں کو اپنے ساتھ مسند نشین کر لیں اور ان میں اتنی آگہی پیدا کردیں کہ وہ انہیں نہتا کردیں۔ تاہم تعلیم ایک ایسا ہتھیار ہے جو انسانی مساوات کو جنم دے سکتا ہے اور اس سے زیادہ اہم صورتِ حال یہ ہے کہ دولت مند اور مفلس کے درمیان خلیج کو ختم کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک آقا ہو اور ہزاروں غلام۔ اقتصادی مساوات ہی دراصل جمہوریت کی اساس ہونی چاہیے، تاکہ شعور و آگہی از خود آقا و غلام کی خلیج کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں ہمارے معاشرے میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص آزادانہ فیصلے کر سکے، ایک شخص ہزاروں پر حکمران ہے اور اس حکمرانی کی تمام صورتیں ہم سب کو معلوم ہیں بس ضروری ہے کہ ہر شخص قانونِ فطرت کے تحت آگے کی کوشش کرے اور طاقت حاصل کرے تاکہ وہ معذور اور لاچار نہ رہے، غلامی ختم ہو اور بے بسی کا نام و نشان مٹ جائے، عین ممکن ہے کہ یہ خیالات دیوانے کی بڑ سمجھے جائیں لیکن بسا اوقات دیوانگی اور فرزانگی میں کچھ فرق نہیں ہوتا اور جو خیالات خواب ہوتے ہیں وہی حقیقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اگر ہمیں زندگی کو بچانا ہے اور دکھوں کو کم کرنا ہے تو ہمیں افراد کو مضبوط کرنا ہوگا اور یہ تعلیم اور ہنر سے ہی ممکن ہے۔ بادی النظر میں کوشش جاری ہے، لیکن ان کوششوں کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انسانیت سکھ کا سانس لے اور خلقِ خدا اپنی زندگی کو سکون اور راحت سے گزار سکے۔

☆☆☆☆

عالمی گاؤں کا چراغ۔۔۔۔ولیم شیکسپیئر

یوں تو زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں ادیبوں، شاعروں اور ڈراما نگاروں نے ہمیشہ روشنی کی ہے۔اور بیشتر نے شرق و غرب اور شمال و جنوب میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔لیکن بعض نام ایسے ہیں جنہیں اگر ہم دنیا کے روشن چراغ تصور کر لیں تو کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہوگا،ادب چونکہ زندگی کا آئینہ ہے اور یہ کسی کالے، گورے، امیر، غریب اور ادنٰی و اعلٰی میں تمیز نہیں کرتا بلکہ زندگی کے دکھوں اور خوشیوں کو معروضی نظروں سے پیش کرتا ہے،اس لئے ادب کی آفاقیت اور دو ہمہ گیری سے انکار ممکن نہیں ۔سوفوکلیز نے پچیس سو سال پہلے جو کچھ کہا وہی ہمارے دور میں ٹی ایس ایلیٹ، علامہ اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور جیسے ادبا اور شعرا کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کیونکہ ان کا تعلق بنیادی انسانی جذبوں سے ہے۔سوفوکلیز نے تقدیر کی فرماں روائی کا ذکر کیا ہے تو اقبال نے انسانی ہمت اور سعی کو اہم ترین گردانا ہے، ٹی ایس ایلیٹ نے موجودہ دور کی لایعنیت اور بے ربط زندگی پر روشنی ڈالی ہے تو رابندر ناتھ ٹیگور نے عالمی امن اور آشتی کے نغمے گائے ہیں،یہ تینوں شاعر گزشتہ صدی کے شاعر ہونے کے باوجود اپنے آفاقی پیغام کے باعث ہمارے اپنے دور کے ترجمان نظر آتے ہیں ۔بلکہ انہی پر کیا موقوف ہر بڑا ادیب اور شاعر خواہ اس کا تعلق کسی صدی اور دور سے ہو وہ ہر صدی اور دور کا نمائندہ ہوتا ہے۔محولہ بالا شعراء کے بارے میں مختلف آراء سامنے آتی رہی ہیں لیکن ولیم شیکسپیئر جس کا تعلق سولہویں اور سترہویں صدی سے تھا ایک ایسا شاعر اور ڈراما نگار ہے جس کے بارے میں ہر دور نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس نے اپنے ڈرامے اور شاعری کے ذریعے جو آفاقی حقائق بیان کئے ہیں ان کے باعث اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور بجا طور پر اسے عہد حاضر میں بھی وہی قبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے جو اسے ماضی میں رہی۔

ہماری رائے میں ہماری اس ریزہ ریزہ دنیا میں اگر کوئی قوت، اتحاد اور یک جہتی کی صورت پیدا کر سکتی ہے تو وہ ادب اور شاعری ہے مشرق اور مغرب کو ہمیشہ مختلف گردانا گیا ہے اور

پچاس سو سال پہلے تک تو ہر ملک کا باشندہ اپنے آپ کو دوسرے ملک کے باشندے سے مختلف سمجھتا تھا کیونکہ رسل و رسائل کے ذرائع بڑے محدود تھے اور باہمی میل جول ممکن نہ تھا۔یہ تصور کہ ہم دنیا کے خواہ کسی حصے میں رہتے ہوں ہم بنیادی طور پر ایک جیسے جذبات اور احساسات رکھتے ہیں صرف ادب اور شاعری کے ذریعے ہی سے ممکن ہے۔جب ہم ایک کردار کو محبت سے سرشار دیکھتے ہیں اور خلوص کا پیکر پاتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہم اپنے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں یوں لگتا ہے کہ سچ مچ انسان خواہ کسی ملک میں رہتا ہو یا کسی دور سے تعلق رکھتا ہو اس کے بنیادی جذبات و احساسات ایک ہی ہوتے ہیں دکھ میں وہ چیخ و پکار کرتا ہے خوشی کے وقت وہ سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے، وصل اور ہجر میں اس کے جذبات یکساں ہوتے ہیں غربت اس پر ایک ہی انداز سے وار کرتی ہے نفرت سے وہ ایک ہی طرح گریزاں ہے اور جب یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے تو عالمی گاؤں، عالمی شہر یا عالمی مملکت کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں، شیکسپیئر کے ڈراموں کا مطالعہ کر کے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ انسان نفسیاتی، جبلی اور احساساتی سطح پر ایک ہی ہیں،اس لئے شیکسپیئر کا مطالعہ عالمگیریت کا مطالعہ ہے آفاقیت کا تجربہ ہے اور پوری انسانیت کو ایک جھلک میں دیکھ لینے کا نام ہے، شیکسپیئر کے ہاں جس قدر تنوع اور رنگا رنگی موجود ہے وہ دنیا کے چند ایک بڑے قلم کاروں میں ہی دستیاب ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسے انگریزی کا سب سے بڑا شاعر اور ڈراما نگار تصور کیا جاتا ہے اور عالمی ادب میں وہ چند ایک انتہائی قد آور اور ممتاز قلم کاروں میں سے ایک ہے۔

شیکسپیئر کے بارے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ سچ مچ ایک نابغہ تھا۔وہ ۱۵۶۴ء سے ۱۶۱۶ء تک دنیائے آب و گل میں زندہ رہا لیکن دنیائے ادب و شعر میں اس نے لازوال مقام حاصل کر لیا۔حیرت کی بات یہ ہے کہ شیکسپیئر Startford کے لوکل گرائمر سکول میں صرف چند سال پڑھا اور پھر مالی مسائل کے باعث تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ۲۳ سال کی عمر میں تلاش معاش کے لئے اسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا۔لندن جا کر اس نے ۳۷ شہرہ آفاق ڈرامے سٹیج کئے اور ہمیشہ

کے لئے اپنا لوہا منوالیا۔ شیکسپیئر کے بارے میں دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ المیہ اور طربیہ دونوں نوع کے ڈراموں میں ایک انتہائی ممتاز مقام رکھتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کوئی ڈراما نگار انتہائی کامیاب المیہ ڈراموں کے ساتھ ساتھ اسی قسم کے طربیہ ڈارمے بھی پیش کر سکے اگر اس کے یہاں غم انتہائی جاں گسل صورت حال میں موجود ہے تو خوشی بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے جہاں آنسوؤں کا سیلِ بلا پایاں ہے وہاں مسکراہٹوں کی پھل جھڑیاں بھی ہیں۔ اگر عالمی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس طرح کا ممتاز ڈراما نگار ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ شیکسپیئر کی تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں بلا کا تنوع ہے شہنشاہ ہو یا گدا، آمر ہو یا جمہوریت نواز، فلسفی ہو یا دانشور، عوام الناس ہوں یا گلی کوچوں میں گھومنے والے افراد، نشے میں سرشار لوگ ہوں یا صحرا نورد، معصوم بچے ہوں یا عیار و مکار اشخاص، ہر ایک اپنی بولی بولتا ہے اور خوب بولتا ہے۔ شیکسپیئر کسی کا مصاحب ہے نہ وظیفہ خوار، اس کا سٹیج ہر ایک کے لئے حاضر ہے، رجائیت پسند کے لئے بھی اور حرماں نصیب کے لئے بھی، بد اخلاق کے لئے بھی اور با اخلاق کے لئے بھی، مذہبی پیشوا کے لئے بھی اور بے دین کے لئے بھی ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور آئینہ زندگی کو پیش کرنے میں اپنے تعصبات بروئے کار نہیں لاتا بلکہ آئینے کے کوئی تعصبات ہوتے ہی نہیں۔ شیکسپیئر کا کمال یہ ہے کہ وہ معروضیت کی جیتی جاگتی تصویر ہے وہ اپنے کرداروں کو پھلنے پھولنے دیتا ہے، اس کا سورج گناہگار اور پارسا پر ایک ساتھ چمکتا ہے۔

شیکسپیئر کا ایک طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ سولہویں صدی میں اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر مواقع فراہم کئے جائیں تو خواتین جہدِ حیات میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ بسا اوقات وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مردوں کو پیچھے بلکہ بہت پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں کوئی ایسا انسانی جذبہ موجود نہیں جس کا اظہار شیکسپیئر کے ڈراموں میں نہ ہوا ہو۔ اس کا ہر ڈراما ایک دنیا ہے، اس کا ہر کردار آفاقی ہے، اس کے ہر جملے کی رگوں میں زندگی دوڑتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شیکسپیئر سے غلطیاں نہیں ہوئیں یا وہ نقائص سے مبرا ہے یا یہ کہ اس نے زندگی کے بارے میں کوئی

فتویٰ دے دیا ہے یا حرفِ آخر کہہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام تر کمزوریوں کے باوجود ایک مینارہ نور ہے اور انسانی جذبوں کا ایک بحرِ زخار ہے اس کی صلاحیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ نقائص پر نظر پڑتی ہی نہیں میتھیو آرنلڈ جیسا نقاد کہہ اٹھتا ہے۔

" All abide our questions but thou art free"

شیکسپیئر پر کتابیں نہیں بلکہ لائبریاں تحریر ہوئی ہیں بلکہ مغرب میں تحقیق اور تنقید کے میدان میں داخل ہونے کے لئے شیکسپیئر کی عظمتوں کو تحریری ہدیہ تبریک پیش کرنا کم و بیش ناگزیر ہے جس نے شیکسپیئر پر کچھ نہیں لکھا، اس نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ یہ چند سطور اس لئے درج کی گئی ہیں کہ شیکسپیئر کو پڑھنے اور پڑھائے جانے کی ضرورت ہے، سمجھنے اور سمجھائے جانے کی ضرورت ہے، شیکسپیئر کا مطالعہ زندگی کا مطالعہ ہے۔ شیکسپیئر کا قاری زندگی کا قاری ہے۔ وہ جس قدر شیکسپیئر کا مطالعہ کرتا ہے اسی قدر زندگی قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر میری یہ سطور مبالغہ آمیز لگیں تو شیکسپیئر کے ڈرامے

King Lear,Hamlet, Othelo, Macbeth,Julius Caesar,Twelfth Night,As you like it اور Merchant of Venice کا مطالعہ کر لیجیے اور اگر ان کو پڑھنے کے بعد میری آراء سے اختلاف ہو تو مجھے ان آراء کو پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ میتھو آرنلڈ نے کہا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ مذہب اور فلسفے کی جگہ شاعری لے لے گی۔ ہماری رائے میں ادب ایک بہت بڑی اخوت ساز قوت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شیکسپیئر جیسے نابغۂ روزگار ادیبوں اور شاعروں کو ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے خواہ ان کا تعلق کسی زبان اور کسی بھی عہد سے ہو انہیں اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے شائد اس طرح ہم موجودہ خوفناک صورتحال سے نجات پا سکیں اور انسانیت کو ایک جسدِ واحد کی طرح دیکھ سکیں۔

”بے چارے ادیب“ اور ”بے سہارا“ فنکار

ادب و فن کی تقدیر بڑی حد تک نا قابلِ فہم رہی ہے۔ دل ہمیشہ ادب و فن کے واری واری جاتا رہا ہے اور دماغ نے اسے حیلے بہانے سے رد کرنے کی کوشش کی۔ ادب و فن کا طلسم ہوشربا رنگ بن گیا۔ یہ وہ جادو رہا جو سر چڑھ کے بولا، اس نے محفلیں سجائیں، تقریبات کو رنگین کیا، تنہائی کو رفاقت عطا کی، گھٹے ہوئے جذبات کو زبان دی، دل کے لاوے کو محفوظ راہیں عطا کیں، زبان و بیان کا حصہ بنا اور جانے اس سے کیا کیا کام لئے گئے لیکن انسانی شعور کے آغاز ہی سے فن کے ساتھ کم از کم فکری سطح پر ہمیشہ سوتیلی اولاد جیسا سلوک ہوا۔ فن و شعر کے سب سے پہلے نقاد اور اپنے دور کے انتہائی معتبر دانشور افلاطون نے فن کو سرے ہی سے اپنی مثالی مملکت سے نکال باہر پھینکا۔ اس نے کہا کہ فن بالخصوص ڈراما جس میں شاعری، رقص اور موسیقی بھی شامل تھے کسی طرح انسانی فوز و فلاح کا داعی نہیں ہو سکتا اس نے کہا، شاعر اور فنکار جھوٹ بولتے ہیں اور اس لیے ان کا اثر مخرب الاخلاق ہے۔ اس کا خیال تھا کہ فن حقیقت سے کوسوں دور ہے اور اسکے شارحین نے اس کے حوالے سے کہا کہ یہ حقیقت سے تین گنا دور ہے اور انہوں نے اس کے لئے ”Thrice removed from reality“ کا جملہ استعمال کیا۔ یعنی اس کا خیال تھا کہ اصلیت تو عالمِ مثال میں موجود ہے ”Ideal World“ پھر ساری مخلوق اس عالمِ مثال کی نقل ہے۔ شاعر و ادیب نقل کی نقل کرتے ہیں، چنانچہ فن پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تیسرا الزام یہ تھا کہ فن جذبات کو بھڑکاتا ہے اور یوں فن سے لطف اندوز ہونے والا اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے، اس کے موقف سے انکار کرنا گردن زدنی تھا لیکن کچھ یوں ہوا کہ اس کے اپنے شاگرد ارسطو نے اپنے استاد کا نام لئے بغیر دلائل کو رد کر دیا اس نے کہا فنکار جھوٹ نہیں بولتا وہ تو یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں صورتِ حال میں فلاں عمل سرزد ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی بات وثوق سے کہتا ہی نہیں تو اسے دروغ گو کیسے کہا جائے گا اس نے کہا کہ فنکار کا تعلق براہِ راست عالمِ مثال سے ہوتا ہے۔ اس لئے نقل کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر یہ کہ فن سفلی جذبات ابھارتا نہیں بلکہ ان کی تہذیب کرتا ہے۔ انسان کے سینے میں کھولتے ہوئے جذبات انتہائی تسکین آور انداز سے اظہار پاتے ہیں۔ لیکن جو کچھ افلاطون نے کہہ دیا تھا وہ صدیوں تک بلکہ آج بھی عوام الناس کے اذہان کو متاثر کرتا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ افلاطون خود ایک بڑا فنکار تھا۔ جانے وہ کس ترنگ میں آ کر یہ سب کچھ کہہ گیا، بعد ازاں نقادانِ ادب و فن نے ادب و فن کو اخلاقیات کی بیساکھی پر چلانا چاہا اور آج تک یہ کوشش جا ری ہے۔ لیکن عجب بات یہ ہے کہ فن سے لطف اندوز ہونے کے باوجود بھی فن کی اہمیت سے اکثر و بیشتر انکار کیا گیا۔ شاید اخلاقیات ہمیشہ جمالیات پر حکمراں رہی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ ہر ذی شعور اور ذی احساس کو قدرت نے جمالیاتی حس سے نوازا ہے۔ اچھا نغمہ سنتے وقت بے ساختہ انگلیاں تھرکنے لگتی ہیں اور پاؤں جنبش میں آ جاتے ہیں، پورے جسم پر اس کا بڑا واضح اثر ہوتا ہے۔ اچھی تصویر کے دیکھ کر رنگوں کا جادو دیکھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ الفاظ کا حسنِ استعمال جب موزوں کلام بن کر جلوہ گر ہوتا ہے تو دل کے تار از خود بج اٹھتے ہیں اور روح نغمہ سرا ہو جاتی ہے۔ فن کی تاثیر سے صوفیا نے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے، محافلِ سماع برپا کر کے جانے کتنے پتھر دلوں کو موم کر دیا۔ اور جب فن سے جذبات کو انگیخت کرنے کا کام لیا گیا تو میدانِ جنگ میں پُشتے کے پُشتے لگ گئے۔ فن کے جادو سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا لیکن اگر فن کار اپنے فن کو منفی اقدار کے لئے استعمال کرے تو یہ فنکار کا قصور ہوگا نہ کہ فن میں کوئی خرابی۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ زندگی کے کسی پہلو پر نظر ڈال لیں فن کی کارفرمائیاں آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گی، مسجد کے ممبر سے لے کر سیاسی اکھاڑوں تک اشعار کو اوڑھنا بچھونا بنایا جاتا ہے۔ غزلیں اور گیت ہمیشہ لکھے گئے اور گائے گئے، لوگ سنتے رہے اور سر دھنتے رہے، جانے شعر و ادب نے کتنوں کے آنسو پونچھے اور کتنے لوگوں کے حوصلے بلند کئے اور کس کس طرح زندگی کو آئینہ دکھایا، ناول اور افسانے کے ذریعے زندگی کے ایسے حقائق واشگاف ہوئے جو کبھی کسی فرد کی مختصر سی زندگی میں ممکن ہی نہیں تھے۔ Tolstoy کے ناول ہوں کہ شیکسپیئر کے ڈرامے، حافظ کے اشعار ہوں

کہ غالب کا کلام، سب میں زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے اور اپنے ایسے ایسے گوشے وا کرتی ہے کہ احساس کی آنکھ واقعی حیرت میں ڈوب جاتی ہے اور قاری اپنی مختصر سی زندگی میں صدیوں کا سفر طے کر لیتا ہے صدیوں کے تجربات اس کی زندگی کو گہرائی اور گیرائی عطا کرتے ہیں۔

بایں ہمہ ادیب "بیچارہ" رہا اور فن کار "بے سہارا" ہے۔ کیسی ستم ظریفی ہے؟ کتنا بڑا ظلم؟ چند چھکے اور چوکے لگایئے، زندگی کی تمام آسائشیں سمیٹ لیجیے، کچھ گول کر دیجیے ساری گول زمین زیرِ نگیں ہو جائے گی۔ کچھ ٹکے لگا دیجیے، سب کچھ مٹھی میں آجائے گا، سیاست کی بانسری بجایئے اور دنیا کے دل جیت لیجیے، لیکن شاعر، ادیب اور فنکار جو سچ مچ زندگی کو زندگی بناتا ہے دکھوں کو بانٹتا ہے، دکھ کا ٹا کا ٹا جانے کہاں گم ہو جاتا ہے، جس کے اشعار نے لاکھوں کو زندگی دی کوئی ایک بھی اسے زندگی کے پرسکون لمحے نہ دے سکا۔ راتوں کو جاگ کر خوشیوں کو بانٹنے والا خود خوشیوں سے محروم رہا۔ اگر کسی نے کسی مڈھ بھیڑ میں کسی ایک کو بچا لیا کسی محاذ پر کوئی کارنامہ سرانجام دے دیا تو تمام اعزازات اور تمغے اس کے سامنے ڈھیر ہو گئے اگر کسی کے شعر اور فن نے ہزاروں کے آنسو پونچھے، لاکھوں کو حوصلے دیے، مایوسیوں سے بچایا، اعتماد پیدا کیا، زندگی کے خاکے میں رنگ بھرے اور کائنات کو خوبصورت بنایا تو وہ نانِ شبینہ کو بھی ترستا رہا اور گھٹنے رگڑ رگڑ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اگر آپ ذہنِ رسا رکھتے ہیں اور محسوس کرنے والا دل آپ کے سینے میں ہے تو آپ ان حسن کے پرستاروں اور انسانیت کے علمبرداروں کے دکھوں کو محسوس کر سکتے ہیں اور پھر آپ کو یہ احساس ہوگا کہ فن اور ادب کے ساتھ کتنی ناانصافی ہوئی۔ کاش! کوئی ایسی عدالت موجود ہوتی جہاں ادیب اور فنکار اپنا مقدمہ پیش کر سکتے۔ ہاں! ایک عدالت ہے اور یہ عدالت ہے انسانی ضمیر کی جو بوجوہ مصلحت کا شکار ہے۔

☆☆☆☆

مشاعرے کیا ہوئے!

اس دوڑتی بھاگتی، گرتی پڑتی اور سوتی جاگتی دنیا میں اول تو کسی کے پاس وقت ہی نہیں کہ وہ پل بھر کو یہ سوچے کہ کیا کیا کچھ، کہاں کھو گیا اور اگر کوئی سوچے بھی تو محرومی اور مایوسی کے سوا اسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مانا کہ موجودہ مشینی دور نے ہمیں محیر العقول سہولتیں فراہم کر دی ہیں، ہم بے بال و پر اڑنے لگے ہیں، ہماری سماعتوں اور بصارتوں نے برقی قوت حاصل کر لی ہے کہ لاکھوں میل سے کسی کو کچھ کہیے، کسی سے کچھ سنیے، کسی کو دیکھیے، کسی کو دکھایئے اور جتنا سوچیے اتنا ہی حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن ان تمام تر مادی آسائشوں کے باوجود کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ ہم نے پایا کم اور کھویا زیادہ۔ کتنی خوبصورت شامیں اور دل کش صبحیں اس دور کی چھینا جھپٹی کی نذر ہو گئیں۔ کتنی پرسکون راتوں کی نیند غارت ہو گئی، کتنے ہنستے گاتے دن آبدیدہ ہو گئے، بہت کچھ چھن گیا، جانے کیا کیا کچھ لٹ گیا۔

ان بیش قیمت راحتوں میں ایک راحت وہ لمحات بھی فراہم کرتے تھے جب شعر و ادب کے دلدادہ کہیں اکٹھے بیٹھ جاتے اور شعروں میں اپنی داستانِ خونچکاں بیان کرتے اور کبھی دل کش لمحوں کی یادوں کو تازہ کرتے۔ یہ نشستیں بھی کیا نشستیں تھی، گاؤ تکیے، چاندنی، الائچی، پان، شمع اور شمع پر مرمٹ جانے والے پروانے، ایک ایک کی باری آتی اور شعر کہتا، میرِ مشاعرہ سے مخاطب ہوتا "اجازت ہے حضور" جواب ملتا "کہیے، عطا کیجیے" اور پھر غزلیں، نظمیں پڑھی جاتیں داد و تحسین ملتی، یوں نہیں کہ ہر شعر پر مرے مٹے جا رہے ہیں بلکہ اس شعر پر جو دل کے تار کو چھو لیتا وگرنہ سب خاموش بیٹھے رہتے۔ شاعر اپنا کلام سنا چکتا یوں کہہ لیجیے کہ شمع اس کے سامنے سے ہٹا لی جاتی اور دوسرے شاعر کے سامنے رکھ دی جاتی۔ ادب و شعر کی یہ محافل مشاعرے کہلاتی تھیں۔

یہ مشاعرے بڑی تہذیبی، ثقافتی، ادبی، علمی اور لسانی اہمیت رکھتے تھے، مجال ہے جو کوئی غیر موزوں

شعر پڑھ لے یا کوئی غیر شعرانہ لفظ استعمال کرے، ہاں جب کوئی شعر ہوتا، بچ بچ دل کو چھونے والا شعر تو تمام حاضرین دل کھول کر داد دیتے۔ مرحبا، سبحان اللہ! کی آوازیں بلند ہوتیں اور اس طرح آہستہ آہستہ ایک تنقیدی شعور جلوہ گر ہوتا مولانا آزاد نے "آبِ حیات" میں اور رام بابو سکسینا نے تاریخِ ادب اردو میں ان محفلوں کے مرقعے جس خوبصورتی سے پیش کئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں۔ انہوں نے ان محافل کو زندہ و جاوید بنا دیا ہے۔ اس معتبر تہذیبی ادارے نے اردو زبان کے ارتقاء میں گراں بہا کردار ادا کیا، بڑے قد آور شاعر پیدا کئے، بڑی ممتاز شخصیات ابھریں اور ہمیشہ زندہ رہنے والے شعر تخلیق ہوئے، ایسے اشعار جو زندگی سے بھرپور تھے اور زندگی کی گھٹن سے نجات دلاتے تھے، یہ مشاعرے کیا تھے، گھٹن میں ہوا کا اک تازہ جھونکا تھا، بے آب و گیاہ زمین میں بارانِ رحمت، لیکن پھر یہ سب کچھ آہستہ آہستہ احساسِ سود و زیاں نے برباد کر دیا۔ اس بربادی کی زد میں مشاعرے بھی آئے اور پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ علم و ادب کے یہ سوتے خشک ہو گئے، کتھارسس کے یہ ذرائع نایاب ہو کر رہ گئے اور یوں پل بھر کو میسر آنے والی راحت سے محرومی نے زندگی کے لمحات کو تلخ تر بنا دیا۔

بظاہر مشاعرے ختم نہیں ہوئے، ہاں اتنا ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ انجمنِ توصیفِ باہمی کی شکل اختیار کر گئے، اگر کسی کو داد ملی تو اس نے بھی داد دی، احباب اپنے احباب کو نوازنے لگے، یا پھر سماجی مرتبہ پر فائز افراد داد و تحسین سمیٹنے لگے۔ یوں بھی ہوا کہ غزل کسی نے لکھی اور پڑھنے والا کوئی اور تھا۔ شاعر ارزاں بکنے لگے اور اور شاعری کے دام بھی کم ہو گئے۔ پھر یہ صورت حال اور بھی مخدوش ہو گئی، ناموزوں شعر بار بار سنا جانے لگا تا کہ غیر موزوں کلام کہنے والے کا تمسخر اڑایا جا سکے مگر اس تمسخر نے کوئی مثبت خدمت سرانجام نہیں دی۔

وزن سے گرے ہوئے کلام کو جتنی داد ملی اس کا تصور بھی محال ہے۔ چنانچہ یوں مشاعرے اپنی افادیت کھو بیٹھے، محبتوں کے یہ سرچشمے نفرتوں کی آماج گاہ بن گئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ادارے کو اس کا اصلی رنگ و روپ عطا کیا جائے لیکن ہمارے دور میں ایسا ممکن

کہاں ہے، ہر شخص سایوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے، رات ہی رات میں سب کچھ سمیٹ لینا چاہتا ہے اور اب تو زبانِ اردو ایک عجیب المیہ سے دوچار ہے، زبان کی اہمیت اس کے بولنے والے سے ہوتی ہے اور اگر بولنے والے ہی نحیف و نزار ہوں گے تو زبان از خود زندگی اور زندہ دلی سے محروم ہو جائے گی۔ سوچتا ہوں کہ اردو زبان اپنا جغرافیہ کم کرتی جا رہی ہے کوئی سرائیکی کا دلدادہ ہے تو کوئی ہندکو کا، کسی کو سندھی ہی زبان نظر آتی ہے تو کوئی پشتو کو عالمی زبان تصور کر لیتا ہے۔ انگریزی تو پھر انگریزی ہے جبکہ اس کے بولنے والے سارے جہاں پہ حکمران ہیں تو اس کی حکمرانی کو کون چیلنج کرے گا، زندہ قومیں زندہ زبانیں جنم دیتی ہیں اور قومیں جب ہمت ہار جاتی اور زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں تو پھر ان کی زبانیں بھی دم توڑ دیتی ہیں۔

کل تک زبان فارسی کا طوطی بولتا تھا آج کتنے ہیں جو زبانِ فارسی سے واقف ہیں۔ عرب ممالک میں تیل کی دریافت نے عربی سیکھنے کی طرف توجہ مبذول کروائی، لیکن پھر صورت حال بدل گئی اور دنیا ایک طاقت کی عمل داری میں آ گئی۔ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہم من حیث القوم اپنے وجود کی بقاء کی فکر کریں اور پھر جب ہم وہ قوت حاصل کر لیں جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھی تو پھر ہمارے سب ادارے بھی بحال ہو جائیں گے اور ہم بھی اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکیں گے۔

بات کہیں سے کہیں نکل گئی لیکن بات کو کہیں سے کہیں نکل جانا ہی ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بات بنانے کے لئے بات کا اہم ہونا ضروری ہے اور بات اہم اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی ایسے فرد اور قوم کی زبان پر آئے جو زندہ اور باشعور ہو ایک مشاعرے پر ہی کیا موقوف ہمارے بہت سے ادارے اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں، جب ادارے ہی نہ رہیں تو قوموں کا شیرازہ منتشر ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ ہمیں ابھی کچھ اور آزمائشوں اور اذیتوں سے گزرنا ہو گا، کیونکہ ابھی بلبلِ زندگی کا نالہ خام ہے، ابھی وہ قیامت کی گھڑی نہیں آئی جب ہم دوبارہ جی اٹھیں گے اور نئی زندگی کا آغاز کر دیں گے

☆☆☆☆

دلیلِ کم نظری قصۂ جدید وقدیم

ہر دن نے آنے والے دن کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں لیکن اگلا دن ضرور طلوع ہوا ہے۔ہر زمانہ تا ابد اپنی مہرِ حکومت ثبت کرنے کا خواہاں رہا ہے لیکن نیا زمانہ آ کر رہا ہے،ماضی کے بتوں سے حال ہمیشہ جنم لیتا رہا ہے اور روایت نے ہمیشہ جدت کی آبیاری کی ہے خواہ یہ شعوری ہو یا لاشعوری،حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی اصولِ حیات ہے،زندگی کا جزوِ لاینفک ہے،فطرت کا تقاضا ہے۔Heraclitus نے کہا تھا There is nothing permanent except change،کارل مارکس نے تغیر کو ایک آفاقی قدر کے طور پر تسلیم کیا ہے ایک اور نقاد کے مطابق وہ قوم بڑی بدقسمت ہے جو تغیر سے گریزاں ہے۔تبدیلی کا مطلب ماضی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا نہیں بلکہ ماضی کو فطری طور پر آگے کی طرف لے کر جانا ہے،خوب سے خوب تر بنانا ہے۔اس حوالے سے پروفیسر "White head" نے بہت عمدہ بات کہی ہے،اس کے خیال میں ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ تبدیلی کے عمل میں بھی نظم وضبط قائم رہے اور یہ کہ نظم وضبط تبدیلی کے عمل کو روک کر نہ رکھ دے۔

تغیر ایک حقیقت ہے ناقابلِ تردید حقیقت،تبدیلی کو آنا ہی ہوتا ہے اور ہمیشہ آتی رہی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض اسالیب حیات کو افراد اور معاشرے اپنی انا کا حصہ بنا لیتے ہیں،بعض رسوم اور روایات کو وہ اس قدر اہمیت دینے لگتے ہیں کہ انہیں تبدیل کرنے کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہیں آتا بلکہ انہیں موت اور زندگی کا سوال بنا لیتے ہیں۔میں فلاں کپڑا پہنتا ہوں بس یہی کپڑا سب کو پہننا چاہیے،مجھے فلاں وقت نیند آتی ہے سب کو اس وقت سو جانا چاہیے،مجھے فلاں اصول پسند ہیں انہی کو اصول زندگی ہونا چاہیے،یہ میرا اعتقاد ہے یہی سب کا اعتقاد ہونا چاہیے،جب میں کہتا ہوں کہ زمین چپٹی ہے تو اسے کوئی گول کیوں کہے،جب میں سمجھتا ہوں کہ خواتین کو میرے

تصورات کے مطابق رہنا چاہیے تو ان تصورات کو تبدیل کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے۔انہی افراد اور معاشروں نے ہمیشہ ترقی کی راہ کو روکا،تبدیلی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے مخالفین کو تہ تیغ کیا،دار پر چڑھایا،زہر دیا،زندہ درگور کر دیا،بلکہ بعض اوقات ایک طرزِ زندگی نے دوسری طرزِ زندگی کو نیست ونابود کرنے کی کوشش کی،ازمنائے وسطیٰ میں تبدیلی گناہ تصور کی جاتی تھی اور سچ پوچھیے تو برِصغیر ہندو پاک میں تو اب بھی ازمنۂ وسطیٰ ہی بڑی حد تک موجود ہیں۔آپ چند شہری علاقوں سے پرے جا کر دیکھیے ازمنۂ وسطیٰ کی جیتی جاگتی تصاویر آپ کو ملنے لگیں گی۔مزے کی بات یہ ہے کہ مخصوص اسلوبِ حیات کو ماننے والوں نے اپنے اسلوبِ حیات کو کبھی مذہب کا چولہ پہنایا تو کبھی ثقافت کا کبھی طہارت کا تو کبھی پاکیزگی کا۔

منشائے فطرت یہ ہے کہ زندگی آگے کی طرف رواں دواں رہے،لوگ اپنے تجربات سے سیکھیں،علم کو زندگی میں آزمائیں اور ذاتی اور شخصی تجربات سے نت نئی راہیں تلاشیں۔اگر ایسا نہ ہو تو پتھر کا دور دائمی دور ہوتا،اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان ابھی جنگلوں میں رہ رہا ہوتا،اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی زندگی حیوانی زندگی ہوتی لیکن انسان نے اپنے تجربات سے،اپنے وجدان سے،اپنی فکر سے اور زمینی اور آسمانی رہنمائی کی روشنی میں رہنے سہنے کے نت نئے اسلوب تراشے۔بقول اقبالؒ

انداز نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

تجربہ ایک Challange ہوتا ہے آپ جتنا بڑا تجربہ کریں گے اتنا ہی بڑا خطرہ مول لیں گے اس لئے کم حوصلہ اور پست ہمت لوگ ہمیشہ نیا قدم اٹھانے سے گریزاں رہتے ہیں،کسی نے کہا تھا۔

"A conservative is a man who does not think that any thing should be done for the first time."

وہ بارش کے پہلے قطرے سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں کہ کہیں سیلاب نہ آ جائے لیکن

بارش کا پہلا قطرہ زرخیزی کا باعث بھی بنتا ہے اور زندگی کے موسم میں رنگ وروپ بھی بھرتا ہے۔ Rosevelt نے کہا کہ قدامت پرست آدمی کے پاس بھی دو ٹانگیں ہوتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ وہ آگے بڑھنا نہیں جانتا اس بچے کی طرح جس نے ابھی چلنا نہیں سیکھا اور وہ پہلا قدم اس لئے نہیں اٹھاتا کہ وہ زمین پر گر جائے گا لیکن جب وہ پہلا قدم اٹھا لیتا ہے تو پھر اس کا قدم رکتا نہیں۔ یہی حال افراد اور اقوام کا ہوتا ہے مانا کہ کچھ اقدار معاشرے کیلئے مفید ہوتی ہیں اور معاشرے نے انہیں ہمیشہ پذیرائی عطا کی ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوچ کے تمام در بند ہو گئے ہیں اور تجربے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ T.S.Eliot نے کہا تھا کہ جدیدیت روایت کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی ماں کی کوکھ سے پیدا ہونے والا بچہ اپنی انفرادیت قائم کر لیتا ہے۔ اس کی اپنی خواہشیں ہوتی ہیں اپنی تمنائیں، اپنے غم، اپنی خوشیاں۔ وہ چیز جو ایک آدمی کے لئے شیریں ہوتی ہے دوسرے کے لئے تلخ ہو سکتی ہے۔ اشیاء کا تعلق مزاج سے بھی ہوتا ہے اور شخصیت کے دیگر رجحانات سے بھی۔ تنوع اور بوقلمونی زندگی کو زندگی بناتے ہیں ورنہ زندگی بے کیف، بے رنگ اور بے ذائقہ ہو کر رہ جائے۔ اسے تو ہر لحظہ نئے طور اور نئی برقِ تجلی کی ضرورت ہوتی ہے اس کی ہر صبح ایک نئی صبح ہونی چاہیے، ہر لحہ ایک نئی خبر ہونی چاہیے۔ صرف یہی خواہش ارتقاء اور فوز وفلاح کا باعث بنتی ہے۔ طب میں تمام تر ترقی اسی خواہش کا نتیجہ ہے ذرائع ابلاغ میں جادوئی تبدیلی اسی خواہش کی رہینِ منت ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں نت نئی ایجادات اسی جذبے کے تحت معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ دراصل ایک کامیاب زندگی کے لئے ماضی اور حال کی تمام فتوحات کو قدر کی نظر سے دیکھا جانا چاہیے کسی شے کو اس بنیاد پر نظر انداز نہ کر دیا جائے کہ یہ تو کل کی بات ہے اور کسی بات کو صرف اس لئے پسند نہ کر لیا جائے کہ اس کا تعلق آج سے ہے، تاہم تجربے اور تبدیلی کیلئے ہمیں ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

عجیب بات یہ ہے کہ عشق کا نام سنتے ہی سامعین طرح طرح کے ردِ عمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی آہ بھرنے لگتا ہے، کوئی اسے مذاق سمجھتا ہے، کوئی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے تو کوئی اسے خیالی پلاؤ سمجھتا ہے، کسی کو قیس وفرہاد یاد آ جاتے ہیں تو کسی کو کوئی بتِ عشوہ گر اور صنمِ کج ادا یاد آ جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عشق زندگی کا جزوِ لاینفک ہے اور اگر مان بھی لیں کہ کوئی عشق سے بچ گیا تو غمِ روزگار سے نہیں بچ سکتا، جس میں سماجی معاشی اور نفسیاتی مسائل شامل ہیں۔

چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ غم زندگی کا لازمی حصہ ہے خواہ اس کی کوئی بھی وجہ ہو۔ ہم غم کی ہمہ گیریت کے تو قائل یقیناً ہیں اور مانتے بھی ہیں کہ غم زندگی کے اتنا ہی قریب ہے کہ جتنا خود ہم اپنی ذات کے قریب، لیکن ہم غم سے سمجھوتہ بھی کر سکتے ہیں، غم کو اپنا دوست بھی بنا سکتے ہیں، غم کو ایک حقیقت کے طور پر قبول بھی کر سکتے ہیں، کبھی کبھی غم کو بھول بھی سکتے ہیں اور غم کی مدد سے بہت سے تخلیقی اور تحقیقی کارنامے بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں وہ زندگی جو غم سے خالی ہے وہ روکھی پھیکی زندگی ہوگی، بے کیف، بدمزا، پھر کیا خواہش رہ جائے گی، کیا تمنا ہوگی، دراصل ہر لحظہ کچھ پا لینے، کچھ حاصل کر لینے کی خواہش ہی زندگی ہے اور اسی سے غم اور خوشیاں جنم لیتے ہیں، جب تک کوئی منزل نہ مل جائے تگ ودو جاری رہتی ہے اور ہزاروں مشکلیں دامن گیر ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی مایوسیاں بھی در آتی ہیں کیونکہ ضروری نہیں کہ ہمیں ہر منزل مل جائے، ہماری ہر تمنا پوری ہو جائے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

گویا بہت کچھ پا لینے کے بعد بھی بہت کچھ کی خواہش ہماری زندگی کی کمزوری بھی ہے اور خوبی بھی۔ اگر خواہش کا شعلہ ٹھنڈا پڑ جائے تو زندگی راکھ کا ڈھیر بن جائے گی، پاؤں تھم جائیں

گے ہاتھ ساکت ہو جائیں گے اور شاید ہم منجمد ہو کر رہ جائیں چنانچہ مشیت کا تقاضا ہے کہ ایک منزل کے بعد نئی منزل کی تلاش جاری رہے۔

مجھے ہر لحہ چلنے کا ہنر دے
مری منزل خدایا دُور کر دے

عجیب بات یہ ہے کہ کوئی کہے کہ اس کی منزل اس سے دور ہو جائے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی سے ہر لحہ چلنے کا ہنر ہاتھ لگتا ہے، ہم نے Ph.D ڈپریشن کی بات کہیں پڑھی تھی یعنی یہ کہ Ph.D کے بعد اور کیا کیا جائے۔ جب کرنے کے لئے کچھ نہ ہو تو پھر اکتاہٹ، بوریت، بنجر پن، کاہلی اور بے حسی کا آغاز ہوگا اور کبھی کبھی مر جانے کو بھی جی چاہے گا، اسی کو ڈپریشن کہتے ہیں، اسی کو افسردگی کہا گیا ہے، ہماری رائے میں غمِ روزگار، غمِ رفتگاں، غمِ یاراں اور غمِ دیار کو رہنا ہی چاہیے۔ صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ سوچ مثبت ہو یعنی یہ کہ غم میٹھا میٹھا ہو، ٹیس ہلکی ہلکی ہو اور پھر ان کی معیت میں سفر جاری رہے۔ برسوں کا سفر، صدیوں کا سفر، نہ ختم ہونے والا سفر، احباب اکثر و بیشتر پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے "یار میں بہت پریشان ہوں"، "بھائی بڑے مسئلے ہیں"، "زندگی اجیرن ہو گئی ہے"، "سمجھ نہیں آتی کیا کریں"۔ ایسی کیفیات بظاہر تکلیف دہ ہوتی ہیں لیکن اگر مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوششیں جاری رہیں اور رویہ مثبت ہو تو یہ کسک، یہ کلک اور یہ ٹیس مہمیز کا کام کرتی ہے اور آگے بڑھنے کی دعوت دیتی ہے، کوئی نہ کوئی راہ تراشنے کی سبیل نکل آتی ہے اور کچھ کرنے کی خواہش ہی نے انسان کو بے پناہ کامیابیوں سے سرفراز کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کچھ پریشانیاں زندگی کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اگر طالب علم کو یہ فکر نہ ہو کہ اسے امتحان دینا ہے تو وہ لمبی تان کر سو جائے، اگر کسی خاتونِ خانہ کو یہ خیال نہ ہو کہ اس کے شوہر اور بچوں کو گھر لوٹنا ہے تو شاید اس کا چولہا ہی گرم نہ ہو، اگر کسی شخص کو یہ خیال ہی نہ ہو کہ اسے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کرنی ہے تو اس میں جدوجہد سرے سے ہی ختم ہو جائے۔ ہمیں فکر رہنا چاہیے کہ ہمیں بجلی کا بل ادا کرنا ہے، ٹیلی فون کا بل دینا ہے، گھر کا سامان لانا ہے، فلاں فائل مکمل کرنی ہے،

فلاح دوست کی عیادت کرنی ہے اور اس طرح کی چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں بعض اوقات پریشان ضرور کر دیتی ہیں مگر یہ پریشانیاں زندگی کی تعمیر کرتی ہیں اور تخریبی سوچ سے نجات پریشانیاں تلخ ہو جاتی ہیں، بہت ہی تلخ! لیکن ایسی صورت میں بھی ہتھیار ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں، یہ جان لینا چاہیے کہ پریشانی کو بالآخر ختم ہو ہی جانا ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو فطرت خود بخود مدافعتی نظام مضبوط کر دیتی ہے اور کہیں سے حوصلے در آتے ہیں تو ہمتیں بحال ہو جاتی ہیں اور یوں زخم مندمل ہونے لگتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پریشانیاں بعض اوقات ہم پر حاوی بھی ہو جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم پریشانیوں کا تجزیہ نہیں کرتے، ہم ان کے اسباب جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم سے کہیں غلطی ہوئی ہے اور ہم ان غلطیوں سے سبق سیکھنا شروع کر دیں تو بہت سی پریشانیوں کا از خود سدِباب ہو سکتا ہے۔ پریشانیاں اور غم آنے ہی ہوتے ہیں، اگر ہمارا رویہ مثبت ہو تو ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ان سے نجات پا سکتے ہیں۔ پریشانیوں سے بچنے کے کچھ طریقے یہ ہیں۔

پریشانیوں سے پریشان ہونے کی بجائے ان کے حل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔
ہماری رائے میں بعض پریشانیاں خالی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں، ایسے میں اگر مصروفیت کی کوئی صورت نکال لی جائے تو آنسو خود بخود خشک ہو کر تھم جائیں اور پتا بھی نہیں چلے گا کہ دن کیسے بیت رہے ہیں، وہ کسی نے کہا تھا!

"A busy man finds no time for tears"

دوستو! پریشانیاں شاید اس وقت تک رہتی ہیں جب تک ہم اپنی ذات کے دام میں ہی گرفتار رہتے ہیں، اگر ہم اپنے احباب کی زندگیوں میں دلچسپی لینے لگیں اور ان کا تقابلی مطالعہ کرنے لگیں تو ہمیں یقین ہونے لگے گا کہ اگر کچھ لوگوں سے ہماری پریشانیاں زیادہ ہیں تو بہت سوں سے کم بھی ہیں۔ ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ جن مصیبتوں سے ہم بچ گئے ہیں وہ اس کا کرم ہے

اور جو ہمیں لاحق ہیں انہیں بھی ایک نہ ایک دن ختم ہو جانا ہے پریشانیوں سے بچنے کا ایک تیر بہدف نسخہ یہ بھی ہے کہ ہم دوسروں کی زندگیوں میں دلچسپی لینے لگیں۔ دوسروں کے دکھ شیئر کرنے لگیں، ان کے مسائل کو کم کرنے کی تدبیر کریں۔ کسی کا سہارا بن جائیں، کسی کی چھڑی بن جائیں، کسی کی آنکھ اور کسی کے ہاتھ پاؤں، اس طرح ہم میں قوتِ برداشت بھی پیدا ہو جائے گی اور ہمیں ذہنی سکون بھی مل جائے گا۔ ہمیں اپنے آپ پر اور دوستوں پر اعتماد کرنا سیکھنا چاہیے کہ اسی طرح ہم اپنے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو عضوِ معطل سمجھنے لگیں تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا اور اگر ہر دوست کو Brutus سمجھ لیں تو بھی بات نہیں بنے گی کہ جہاں Brutus ہے وہاں Anthony بھی ہے۔ ہم اپنی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے فنونِ لطیفہ کا سہارا بھی لے سکتے ہیں، اپنے دکھوں کو تحریر میں لا کر سکون حاصل کر سکتے ہیں، انہیں گا سکتے ہیں اور انہیں خوبصورت کالم میں ڈھال سکتے ہیں۔ کبھی کبھی یادِ ماضی عذاب بن جاتی ہے لیکن جہاں ہمیں ماضی کی تلخیاں جینے نہیں دیتیں وہاں ماضی کی حسین یادیں ہمیں مرنے سے بچا بھی سکتی ہیں۔ جہاں ہمیں محبت نے برباد کیا ہوتا ہے وہاں محبت نے ہمیں وہ نعمتیں بھی عطا کی ہوتی ہیں کہ جن کی یاد ہماری زندگی کو رنگین بنا سکتی ہے ہم شامِ فراق کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن صبحِ آرزو کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ہمیں ہجر کی تلخیاں تو یاد رہتی ہیں مگر وصل کے مزے اکثر و بیشتر ہمارے ذہنوں سے محو ہو جاتے ہیں، ہمیں زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنے ذہنی رویوں کو تبدیل کرنا ہوگا اور قوتِ برداشت پیدا کرنا ہو گی "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کرنا ہوگا، کسی کو معاف کر دینے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی اور اگر ہم یہ ارادہ کر لیں کہ ہمیں اپنی پریشانیوں کے ساتھ ہی جینا ہو گا تو ہماری زندگی قابلِ برداشت ہی نہیں خوشگوار بھی ہو سکتی ہے۔

☆☆☆☆

ترقی

ترقی کہہ لیجئے یا ارتقاء، استفادہ کہہ لیجئے یا منفعت، دوسرے کو پچھاڑ کر آگے بڑھ جانے کی خواہش کہہ لیجئے یا دوسروں سے سب کچھ ہتھیا لینے کا جذبہ، اپنا الوسید ھا کرنے کا نشہ اور اپنا گھر بھر لینے کا جنون، یہ سب کچھ اور جانے کیا کیا کچھ ہمارے عہد کی نام نہاد ترقی کا جزو لاینفک ہے بلکہ ایمان کامل ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ہر فرد میں اور ہر قوم میں آگے بڑھنے کی خواہش ہونی چاہیے، اپنی حالت کو سنوارنے کا جذبہ ہونا چاہیے، اپنی ذہنی اور جسمانی بھلائی کی تمنا ہونی چاہیے ،لیکن جب سے انسان نے اکٹھے رہنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے، جب سے وہ سماجی حقیقت بنا ہے اس وقت سے ترقی کا مفہوم سماجی ہو گیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم تحریروں میں تبدیل ہوا ہے، تقریروں میں بدلا ہے، ادبیات میں استعمال ہوا ہے، مصلحین اور مبلغین نے اس کی بات کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یونانیوں کا عمرانی معاہدہ محض اصولاً ہوا تھا، ذہنوں پر تحریر نہیں ہوا تھا، دلوں نے اس کو قبول نہیں کیا تھا، یہ انسان کی سوچ اور عمل کا حصہ نہیں بنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ نے باہمی ظلم و استبداد کی خونچکاں کہانیاں رقم کی ہیں۔ انسانیت نے اپنا سارا کمایا ہوا باہمی چپقلش کی نذر کر دیا ہے۔ اس کی قومی اور ملی تگ و تاز کا ۷۰ سے ۸۰ فیصد جنگی تیاریوں پر خرچ ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک بہت بڑا لمحۂ فکریہ ہے کہ جب انسان نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے مل جل کر رہنا ہے اور یہ کہ وہ تنِ تنہا نہیں رہ سکتا، ایک فرد دوسرے فرد کی مدد کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا، ایک فرد سارے علوم و فنون نہیں سیکھ سکتا اور نہ ہی وہ اپنی مادی اور روحانی ضروریات پوری کر سکتا ہے تو پھر اس کے عمل میں اور اس کی فکر میں تبدیلی آنی چاہیے تھی لیکن بدقسمتی سے ایسا بہت کم ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس معاہدۂ عمرانی سے قبل بھی اچھے انسان بستے ہوں گے، علم و ادب کی ترویج سے پہلے بھی انسانی ہمدردی کی مثالیں موجود ہوں گی، کیونکہ ایسا ہمیشہ ہوا ہے کہ جہاں بڑی تکلیف دہ صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہاں کہیں

کہیں دل کشاواقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور ہمدردی، اخوت، ایثار اور سماجی انصاف کی حوصلہ افزا مثالیں مل جاتی ہیں اور بڑے روح پرور واقعات سامنے آتے ہیں، لیکن اگر عمومی طور پر صورتِ حال کا مشاہدہ کیا جائے تو حالت اندوہناک نظر آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ انسان اب بھی جنگل کے دور کا باسی ہے اب بھی وہ سب کچھ اپنے لئے اور صرف اپنے لئے حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ ایک مفکر نے کہا تھا کہ "اگر آدم خور چھری کانٹے استعمال کرنے لگے تو وہ مہذب نہیں کہلوائے گا۔ اگر بندوق کی بجائے میزائل استعمال ہونے لگیں تو ہم اسے کسی صورت انسانی ارتقاء کے لئے فعلِ نیک قرار نہیں دے سکتے"۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی اور ارتقاء کے مفہوم ہی کو سمجھا نہیں گیا ہے ایسا ممکن نہیں کہ آپ کوئی پودا لگائیں اور اس کے ارد گرد پانی کا اہتمام نہ ہو اور بادِ سموم چل رہی ہو تو وہ پودا پھلنا پھولنا شروع کر دے۔ بنجر دھرتیوں میں پھول کاشت کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا اگر کوئی شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دنیا کی ساری سہولتیں اور آسائشیں سمیٹ لے تو مادی طور پر بہت آگے بڑھ جائے تو محفوظ و مامون رہے گا تو یہ ممکن نہیں، چاروں طرف غربت زدہ شکم ایک دن اپنی بھوک کو بجھانے کے لئے اسے استعمال کریں گے اگر سماجی انصاف موجود نہیں ہوگا تو مظلوم ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا اور غیر اخلاقی حربوں پر اتر آئے گا۔

ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہم کسی ایوان نما گھر میں رہتے ہیں جس میں زندگی کی تمام آسائشیں ہم نے ڈھیر کر لی ہیں۔ لیکن ہمارے ارد گرد غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ سڑاند اس کی بو ہے تو ہم کس طرح بیماری سے بچ سکتے ہیں، ہماری صحت کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ اچھی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ارد گرد کا ماحول بھی صاف ستھرا ہو، تمام بستی غلاظتوں سے محفوظ ہو کیونکہ آب و ہوا کا تعلق مجموعی جغرافیائی صورتِ حال سے ہوتا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود عملی زندگی میں اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں، ہر شخص کہتا ہے کہ میں ترقی کرنا چاہتا ہوں، دیکھو میرے آباء و اجداد سائیکل پر چلتے تھے، پھر موٹر سائیکل استعمال ہونے لگا اور اب میں کار استعمال کر رہا ہوں یقیناً یہ صورتحال بعض اوقات خوشی کا باعث

بنتی ہے لیکن بائیسکل کی جگہ کار استعمال کرنے سے ہم اپنے وقت کو بچا تو سکتے ہیں لیکن یہ بچا ہوا وقت کس طرح استعمال کیا جائے یہ بات زیادہ اہم ہے۔ اگر آپ کار پر بیٹھ کر چند لمحوں میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں وقت گپ شپ کی نذر کر دیتے ہیں تو آپ کو آپ کی برق رفتاری سے کیا حاصل ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایک دور تھا جب ہماری خواہش ہوتی تھی کہ کوئی کبوتر ہمارا پیغام ہمارے محبوب تک پہنچا دے پھر خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا ٹیلی گرام کا آغاز ہوا پھر ٹیلی فون آگئے اور اب موبائل فون اور انٹرنیٹ۔ بتایئے کہ کیا اس تمام صورتِ حال نے ہمیں ایک دوسرے کے زیادہ قریب لا کھڑا کیا ہے؟ کیا ہم زیادہ محبتیں کرنے لگے ہیں؟ کیا ہماری اخوت میں اضافہ ہوا ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہوئی ہے، ہم نے مادی فاصلے کم کر لئے ہیں لیکن روحانی اور نفسیاتی طور پر ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ تو پھر اس ترقی اور ارتقاء نے ہمیں کیا دیا؟ ہم نے اس سے کیا لیا؟ مانا کہ ہم مادی طور پر بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ جہاں کبھی ہم ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے کو ترستے تھے اب ایئر کنڈیشنر ہر وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ہمیں شاد کام رکھتا ہے۔ لیکن اگر ایسے میں خود غرضی کی آگ ہمارے سینے میں بھڑک رہی ہو اگر ہم تنہائی کا شکار ہوں اور اپنے معاشرے سے، اپنے احباب سے اور اپنے اہلِ محلہ سے کٹ کر رہ گئے ہوں تو یہ ٹھنڈی ہوائیں کسی صورت ہمارے لئے تسکین کا باعث نہیں بن سکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مادی آسائشوں کے باوجود ڈپریشن جیسی مہلک بیماری ہمیں لاحق ہے۔ ہم ہنستے ہیں تو محض اس لئے کہ یہ معاشرتی آداب کا تقاضا ہے، ہنسی دل سے نہیں پھوٹتی بلکہ ہم شعوری طور پر اسے اپنے لبوں پر سجا لیتے ہیں۔

انسان نہ محض ایک مادی حقیقت ہے اور نہ کوئی فرشتہ، وہ جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ذہن میں تبدیلی واقع ہو اور فرد اپنے آپ کو معاشرے کا حصہ تصور کرے اور معاشرہ فرد پر اس قدر غالب نہ آجائے کہ اسے سانس لینا بھی دشوار ہو جائے فرد اور معاشرے کے خوشگوار باہمی تعلقات ہی زندگی کو کامیابیوں سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ معاشرہ افراد

کا مجموعہ ہوتا ہے اور کوئی فرد معاشرے کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کو قبول کیا جانا چاہیے اور معاشرتی انصاف کی صورت نکالی جانی چاہیے۔ ہم بعض اوقات یہ سن کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہماری فی کس آمدنی بڑھ گئی ہے مگر فی کس آمدنی کے حوالے سے مختلف افراد میں کتنا فرق ہے اس کا اندازہ بھی لگایا نہیں جا سکتا، کوئی ارب پتی ہے، ہزاروں اس کے غلام ہیں اور کوئی نانِ شبینہ کو ترستا ہے، کسی کے لئے زندگی کی ساری سہولتیں مہیا ہیں تو کسی کو رات گزارنے کیلئے چھت بھی میسر نہیں، سب جانتے ہیں کہ صورتِ حال یہی ہے لیکن صرف جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ صورتِ حال کو تسلیم کیا جانا چاہیے اور پھر ایسے معاشرے بلکہ ایسی دنیا کے پنپنے کی سبیل نکالنی چاہیے جہاں سب خوشی خوشی رہ سکیں۔ اللہ نے کتنی نعمتیں دی ہیں ہم ان کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ کی زمین مختلف نعمتوں سے بھری پڑی ہے لیکن ان نعمتوں پر طاقت اپنے آہنی پنجے گاڑ لیتی ہے۔ یاد رکھا جائے کہ ظلم کو بالآخر ختم ہو جانا ہوتا ہے، دیر ضرور ہو جاتی ہے اندھیر نہیں۔ لیکن ہماری رائے میں اس کا آغاز ہر فرد کو خود کرنا ہے، کوئی فرد کسی سے کمزور ہوتا ہے تو کوئی کسی سے طاقتور، ہر طاقتور کو کمزور کو ساتھ لے کر چلنا ہے کیونکہ ہر طاقتور سے زیادہ طاقتور موجود ہوتا ہے۔ اگر صرف یہی حقیقت تسلیم کر لی جائے تو زندگی کے دن سنور سکتے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم صورتحال کا ذمہ دار ہمیشہ دوسروں کو قرار دیتے ہیں اور اپنے گریبان میں جھانکنے کی توفیق ہمیں کم ہی ہوتی ہے بلکہ ہوتی ہی نہیں، ہماری رائے میں اگر ہر فرد اپنے حوالے سے حسن و خیر اور صداقت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لے تو روشنی پورے ماحول کو بقعۂ نور بنا سکتی ہے اور محبت کا سورج ہر محل اور ہر جھونپڑی پر طلوع ہو سکتا ہے بلکہ محل اور جھونپڑی کا فرق بھی ختم ہو سکتا ہے۔ یہ کسی Utopia کی بات نہیں، آنحضرتؐ اور صحابہ کرام کے ادوار نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایسا ممکن ہے اور ہماری رائے میں ایسا یقیناً ممکن ہے۔

☆☆☆☆

تعارف نامہ

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

ایم اے انگلش، ایم اے اردو، ایم فل (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ ڈی، سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج سرگودہا، سابق پروفیسر یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور، حال منسلک یونیورسٹی آف سرگودہا، صدر پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ سرگودہا ڈسٹرکٹ، صدر تھنکرز فورم فار سوشل اپ لفٹ لاہور ڈسٹرکٹ، مدیر: ماہنامہ سفید چھڑی۔

پیدائش 15 مارچ 1945ء بمقام کرنال مشرقی پنجاب، آٹھ سال تک عام سکول میں تعلیم پائی اور پھر بینائی ضائع ہو گئی، ان گنت مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنا تعلیمی سفر انتہائی کامیابی سے جاری رکھا، وظائف اور اعزازات حاصل کئے۔ انتہائی اعتماد اور تیقن سے عملی زندگی میں قدم رکھا ان کی جد وجہد، مشکلات و مصائب سے دوچار لاکھوں افراد کے لئے مینارۂ نور ہے۔ وہ انگریزی میں ایم اے کرنے والے پہلے نابینا پاکستانی ہیں، پاکستان بھر میں بطور لیکچرار متعین ہونے والے پہلے فرد ہونے کا اعزاز بھی انہی کو حاصل ہے، نابیناؤں کی ملک گیر تحریک "پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ" کے ایک مدت کے لئے بیک وقت ضلعی، صوبائی اور مرکزی صدر منتخب ہوئے۔ مرکزی وزارتِ ثقافت نے انہیں زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں توصیفی سند سے نوازا۔ انہیں سکاؤٹنگ کا صدارتی ایوارڈ بھی عطا کیا گیا اور محکمہ سماجی بہبود نے ان کی خدمات کے اعتراف میں گولڈ میڈل دیا۔ تعلیمی میدان میں ان کی کارکردگی بے بصر حضرات کے لئے تحریک کا باعث ہے کہ انہوں نے ایم فل میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور (Impact of British Poets on Iqbal) کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا، ان کی غزلیات پر مبنی معروف گلوکاروں کی آواز میں دو البم منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اور ریڈیو پاکستان کے سنٹرل پروڈکشن یونٹ نے بھی ان کی غزلیات کی ریکارڈنگ کی ہے۔ وہ علمی اور ادبی جریدے ماہنامہ "سفید چھڑی" کے بانی مدیر ہیں جو گزشتہ اکیس سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے، وہ بے بصر

افراد کے لئے ہی خدمات سرانجام نہیں دے رہے ہیں بلکہ اپنے علاقہ رحمت پارک کی ویلفیئر سوسائٹی کے صدر کے طور پر بھی اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ تابش اکیڈمی کے نام سے ایک پرائیویٹ ادارہ بھی ان کی سرپرستی میں شہر بھر کے بچوں اور بچیوں کے لئے تعلیمی سہولیات فراہم کرتا رہا ہے، گزشتہ 28 سال سے "بزمِ فکروخیال" کے پلیٹ فارم سے، جس کے وہ بانی صدر ہیں، علم وادب کی آبیاری میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں۔

خاندانی تفصیلات:

ان کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے، ان کے والد ماجد جناب شیخ اللہ دیا گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب اور گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 سرگودھا میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے اور پروفیسر شیخ محمد اقبال ایک کامیاب گھریلو زندگی گزار رہے ہیں، تین بچوں کے باپ ہیں، آپ کا بیٹا تابش اقبال ایک ملٹی نیشنل کمپنی لفارج سیمنٹ فیکٹری میں بطور سینئر انجینئر فرائض سرانجام دے رہا ہے، آپ کی بیٹی کوکب اقبال لاہور کے ایک کالج میں انگریزی کی پروفیسر ہے جبکہ دوسری بیٹی کشور اقبال سرگودھا کے ایک سکول میں سینئر انگلش ٹیچر ہے۔

موجودہ سرگرمیاں:

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ہمیشہ نئے طور اور نئی برقِ تجلی کے خواہاں رہے ہیں، انہوں نے گزشتہ 40۔35 سالوں سے بے بصر حضرات کی تعلیم وتربیت کے لئے 131۔رحمت پارک یونیورسٹی روڈ سرگودھا میں ادارہ قائم کر رکھا ہے اور ایک ہمہ جہتی سکول نیو سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا میں قائم ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال شاعری کے علاوہ موسیقی سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں، الغرض ان کی پوری زندگی ایک مشن اور ایک نہ ختم ہونے والا جذبہ ہے تا کہ زندگی کو اس کے باسیوں کے لیے ایک خوب صورت اور قابلِ برداشت جگہ بنایا جا سکے۔

شاعری:

1۔ساحلِ تشنہ لب	(1982)
2۔سوالیہ نشان (پہلا ایڈیشن)	(1989)
3۔سوالیہ نشان (دوسرا ایڈیشن)	(1993)
4۔اک ہمسفر اچھا لگا	(1998)
5۔تلاوتِ دل (مجموعہ حمد ونعتؐ)	(1998)
Love's no Crime۔6	(2005)
7۔یہ کافر دل نہیں مانا	(2007)

تنقید

1۔جون ڈن شخصیت اور شاعری	(1993)
2۔اقبال بحضور اقبال	(1999)
3۔جون کیٹس شخصیت اور شاعری	(2001)

نثر

1۔ذوقِ تماشا	(1993)
2۔جہانِ مہ وپرویں	(1997)
3۔دیدۂ دل	(1998)
4۔کب رات بسر ہوگی	(2001)
5۔آشوبِ آگہی	(2007)

خودنوشت:

1۔پردۂ سیمیں سے (چند سوانحی جھلکیاں) (2009)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پر جو کتب و جرائد شائع ہو چکے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

1۔ماہنامہ "سفید چھڑی" کا پروفیسر شیخ اقبال نمبر (1999)

2۔بیاضِ دل (مرتب: شاہد بخاری ایڈووکیٹ) (2005)

3۔ماہنامہ "سفید چھڑی" کا پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی نظم و نثر سے انتخاب نمبر (2005)

4۔ماہنامہ "رشحات" (لاہور) کا پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نمبر (2007)

5 ۔سلسلہ وار مجلہ "دستک" مری کا پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نمبر (2007)

6۔حرفِ تمنا (مرتب: شاہد بخاری ایڈووکیٹ) (2008)

7۔ڈاکٹر شیخ اقبال شخصیت اور فن (مؤلف: تصور اقبال) (2011)

انعامات و اعزازات

1۔سکاؤٹنگ میں خدمات کے اعتراف میں "صدارتی ایوارڈ"

2۔سماجی خدمات کے اعتراف میں پنجاب سوشل سروسز ایوارڈ

3۔"ستارۂ سماج" منجانب پاکستان سوشل ایسوسی ایشن

4۔"نشانِ خدمت" منجانب ینگ سروسز ویلفیئر سوسائٹی

5۔"پنجاب انجم ایوارڈ" منجانب: انجم آرٹ سوسائٹی و قاسم آرٹ سوسائٹی

6۔تین ایوارڈز منجانب: ایڈیٹرز کونسل سرگودھا (شیلڈ، گولڈ میڈل، شاہین ایوارڈ)

7۔تین شیلڈز منجانب: یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور

8۔شیلڈ منجانب: گورنمنٹ کالج سرگودھا

9۔شیلڈ منجانب: قائدِ اعظم لاء کالج سرگودھا

10۔عمدہ کارکردگی پر قائدِ اعظم گولڈ میڈل منجانب پرائڈ فوجی سوسائٹی ایس اے فاؤنڈیشن لاہور۔

11۔راؤ منان ایوارڈ / شیلڈ برائے خدمتِ انسانیت (منجانب: راؤ منان ڈائیلسز سنٹر سرگودھا)

12۔توصیفی سند، منجانب: وزارتِ ثقافت حکومتِ پاکستان

13۔گولڈ میڈل۔ایم فل (اقبالیات)

☆☆☆☆